بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰـــنِ الرَّحِيمِ

THE MIZANU'L HAQQ

(BALANCE OF TRUTH)

By

C. G. Pfander, D. D.

INDO-ASIATIC PUBLISHERS
B-57. Amar Colony New Delhi 24 (India)

مصنفہ

سی - جی - فینڈر - ڈی - ڈی

۱۸۳۲

فہرستِ مضامین

آٹھواں باب

خاتمہ

اب جاۓِ غور ہے کہ ہماری اپنی ہستی و شخصیت اور طبعیت سے بڑھ کر بھلا کون سی چیز ہے جس سے ہماری عقل کو قربت حاصل ہے؟ اسی لئے قدیم زمانہ ایک یونانی دانا نے تمام بنی آدم کے لئے یہ نصیحت لکھی کہ " اپنے تیئں جان اہلِ یونان نے ان الفاظ کو اس قدر پسند کیا کہ اپنے بڑے بڑے معبودوں میں سے ایک ایک کے مندر کے ستون پر لکھ دیا۔ پھر بعد میں ایک رومی شاعر نے ان الفاظ کی یہاں تک قدر کی کہ ان کو الہامی کے نام سے نامزد کیا۔ پھر اور بھی بعد کے زمانہ کی پراز حکمت عربی امثال میں حضرت علی ابن ابی طالب نے یہی نصیحت زیادہ عمدہ اور شستہ الفاظ میں یوں فرمائی ہے کہ من نفسہ فقد عرف ربہ یعنی جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔ کوئی آدمی بھی خواہ کسی دین سے واسطہ رکھتا ہو اس سے انکار نہیں کریگا کہ اس نصیحت میں سچائی ہے اور یہ ضرب المثل حق ودانش سے پُر ہے۔ بے شک ہمارا اپنا ذاتی عرفان وہ کنجی ہے جس کے وسیلہ سے ہم عرفان الہیٰ کے دروازہ کو کھولنے کی امید کرسکتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی اپنی روح کی آرزوؤں پر توجہ نہ کرے اوراپنے دل کی خواہشوں پر نہ سوچے تو ایسا شخص جو کہ اپنے ہی اندرونی حالات سے ناواقف ہے کیونکہ عرفان الہیٰ کو حاصل کرسکتا ہے؟ ایسے آدمی کے لئے عرفانِ الہیٰ کا دروازہ بالکل بند ہے اور جب تک وہ اپنی روحانی حالت پر غور نہ کرے اور روح کے نہایت گہرے تقاضوں پر نہ سوچے بند ہی رہیگا۔ انسان اس امر کا محتاج ہے کہ خدا کو جانے اوراس کا سبب یہ ہے کہ انسان بلحاظِ عقل وروح خدا

کی صورت پر پیدا کیا گیا تھا۔ چنانچہ مثنوی شریف میں مرقوم ہے۔" ماعیال حضرت ایم وشیرخوار" یعنی ہم خدا کا خاندان اور شیر خوار بچے ہیں۔ پھر لکھاہے کہ الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن عیالہ یعنی لوگ خدا کا خاندان ہیں۔پس خدا لوگوں میں سب سے زیادہ اس کو دوست رکھتاہے جس نے اس کے خاندان سے نیک سلوک کیاہو۔

اگرچہ یہ سچ ہے کہ گناہ اور شیطانی وساوس نے انسان کو خدا سے برگشتہ اور بہت دور کردیاہے اور اس کے سکہ وجود سے اس کے بنانے والے مالک وخداوند کے نام ونشان کو بہت کچھ مٹادیاہے تو بھی انسان کی ذات میں اس کے خالق کی مشابہت تاحال باقی ہے اور اس کو جسمانی اشیا سے ناخوش کرنے کے لئے کافی ہے۔کہتے ہیں کہ حضرت آدم بہشت سے نکال دئے گئے تو سالہسال تک روتے رہے کیونکہ خدا سے دور ہوجانے کے سبب سے فرشتوں کی شیرین آوازوں کو نہیں سن سکتے تھے۔حضرت آدم کی نسل کی حالت پر یہ بات اور بھی صفائی سے صادق آتی ہے ۔ اسی سبب سے بنی آدم کی زندگی اور دلی حالت میں بے چینی وبیقراری بھری ہے کیونکہ قدیم دانا کافرمان سچ ہے کہ " اے خدا تونے ہم کو اپنے لئے بنایا ہے اور ہمارا دل بے آرام ہے جب تک تجھ میں آرام نہ پائے۔"

عشق آن بگزین کہ جملہ انبیاء　　　یافتند از عشق او کارد کیا

جنہوں نے اب تک خدای واحد کو نہیں جانا وہ باطل مذاہب اور دینوی عیش وعشرت میں بے فائدہ دلی آرام تلاش کرتے ہیں۔ وہ اس ماندہ مسافر کی مانند ہیں جو چھلاوے کی پیروی کرتا ہے یہاں تک کہ مایوسی کی سرد دلدل میں غرق ہوجاتا ہے یا اس پیاسے رہرو کی مانند ہے جسے سراب غیر حقیقی چشمہ بادی آب اور خوبصورت نظارے دکھلاتاہے یہاں تک کہ آخر کار ریگستان میں مرنے کے لئے لیٹ جاتا ہے اورا سکی روح کی پیاس بجھانے کو اسے آبِ حیات کا ایک قطرہ بھی نہیں ملتا۔ کسی نے سچ کہاہے کہ کالھا سراب ببعقۃ یحسبہ الظمآن ماءً یزخز نہا الشیطان للانسان الی الممات۔ یعنی یہ دنیا سراب صحرا کی مانند ہے جس کو پیاسا پانی تصر کرتاہے۔ شیطان اس کو انسان کے لئے موت تک آراستہ کرتاہے۔

لیکن خداوند کریم یہ نہیں چاہتا کہ انسان زندگی کے اس لق ودوق جنگل میں گمراہ ہوجائے بلکہ وہ چاہتاہے کہ انسان ہدایت وراہ پا کر اپنے گھر پہنچے کیونکہ اس نے ہم کو اسی غرض سے دنیا میں بھیجا ہے کہ ہم اس کو ڈھونڈیں اور پائیں۔چنانچہ مرقوم ہے من طلب شیاًوجدوجد وجدہ ومن قرع باباً ولج ولج یعنی جو کوئی کسی شے کو ڈھونڈتا اور کوشش کرتاہے پاتا ہے اور جو کوئی استقلال کے ساتھ دراوزہ کھٹکھٹاتا ہے داخل ہوتا ہے۔

سایہ حق بر سر بندہ بود　　　عاقبت جویند دیا بند و بود

عقل والہام ہر دو ہمیں اس حقیقت کا یقین دلاتے ہیں۔ یہ کام کچھ آسان نہیں ہے اور جب تک انسان خدا کی پاک مرضی کو دل وجان سے دریافت کرنے اور ہمیشہ تک عمل میں لانے کا پورے طور سے مشتاق نہ ہو اس کی کوشش میں کامیابی کی امید نہیں ہوسکتی۔ لیکن اگر انسان ان شرائط کو پورا کرے تو خدا کافضل عرفانِ حق کی طرف اس کا رہنما ہوگا کیونکہ کہتے ہیں " بالاعادۃ افادۃ بتکر رحرار الجبل یعنی دہرانے سے فائدہ ہوتاہے اور تکرار کے وسیلہ سے پہاڑ اکھڑ جاتا ہے "۔ بایں ہمہ حق جو کو چاہیے کہ مشکلات کا سامنا کرنے سے نہ ڈرے اور اذیتوں سے پیچھے نہ ہٹے کیونکہ بدکاروں کو نیکوکاروں سے نفرت ہے اور سب سے نیک لوگوں نے اذیتوں کی برداشت کی ہے۔ چنانچہ یوں مرقوم ہے۔ البلاء موکل بالانبیاء ثمہ بالاولیاء وثمہ بالامثلِ فلامثل یعنی بلا سب سے پہلے انبیاء پر آتی ہے پھر اولیا اور پھر بڑے بڑے قابلِ تقلید لوگوں پر۔چنانچہ ایک شاعر بھی کہتا ہے

ہر کہ درین بزم مقرب تراست جامِ بلا بیشترش میدہند

کیونکہ بادشاہ نے آگ میں دسترخوان بچھایا ہے۔" کہ اندر آتش شاہ بہنا است خوان"۔

لیکن کوئی سپاہی حصولِ فتح سے پیشتر صلہ کی امید نہیں رکھتا اوراس لئے شب وروز نہایت مردی ومردانگی سے لڑائی میں مشغول رہتا ہے اور جب تک فتح حاصل نہ ہو ہر گز آرام نہیں لیتا۔ چنانچہ عربی شاعر نے خوب کہا ہے:

بقدر الکد تکتسب المعالی ومن طلب العلیٰ سھر اللیالی

یغوص الجرمن طلب الاوآلی ویحظیٰ بالسیادۃ والنوال

ومن طلب العلیٰ من غیر کدٍ اضاع العمر فی طلب المحال

یعنی محنت کے اندازہ کے موافق بلندی دی جاتی ہے۔ اور جو کوئی بلندی چاہتا ہے راتوں جاگتا ہے جو موتی چاہتا ہے سمندر میں غوطہ لگاتا ہے اور بزرگی ودولت حاصل کرتاہے اور جو کوئی بغیر محنت کے بلندی چاہتاہے تلاشِ محال میں عمر ضائع کرتا ہے۔

اگرآدمی اپنی طبیعت پر غور کرے اوراپنی دلی خواہشوں پر سوچے تو اسے فوراً معلوم ہوجائیگا کہ اس میں اپنے لئے خوشی وخرمی حاصل کرنے کی نہایت زبردست خواہش موجودہے۔ کوتہ اندیش لوگ اس خوشی کو اس دنیاوی فانی کی چیزوں میں تلاش کرتے ہیں اور اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ کوئی فانی اور محض جسمانی خوشی جو کہ چند روزہ اور گذشتنی ہے۔ ہر گز ہر گز غیر فانی روح کی تسکین کا باعث نہیں ہوسکتی کہتے ہیں کہ گذشتہ زمانہ میں ایک بادشاہ تھا جس کی دولت وعشرت لامحدود معلوم ہوتی تھی۔ ایک غریب آدمی نے یہ حالت دیکھ کر رشک کیا اور بادشاہ سے کہا کہ اے بادشاہ تیری خوشی اس دنیا میں بھی کامل ہے۔ لیکن بادشاہ نے اسے شاہانہ لباس پہنا کر ایوانِ نعمت کا دسترخوان اس کے آگے رکھا اوراسے اوپر کی طرف نظر کرنے کو کہا۔ اس غریب نے اپنے سر پر ایک برہنہ تیغ ایک بال سے آویزان دیکھی اور وہ ایسا دہشت زدہ ہو گیا کہ نہ

تو کچھ کھاپی ہی سکا اور نہ ان نعمتوں سے کچھ حظ اٹھا سکا جن سے وہ محصور تھا۔ ہم سبھوں کا یہی حال ہے ۔ ہر ایک انسان کے سر پر عزرائیل یعنی ملک الموت کی تلوار آویزاں ہے۔ انسان اس دنیا میں حقیقی خوشی وخرمی اور راحت کیونکر حاصل کرسکتاہے جب کہ خدا کے حکم سے کسی وقت ملک الموت اسے یوں کہہ سکتاہے کہ "اے نادان آج رات کو تیری جان تجھ سے لے لیجائیگی "۔ حضرت علی ابن ابی طالب نے خوب کہاہے :

انما الدنیا فناء　　لیس للدنیا ثبوت

وانما الدنیا کبیتٍ　　نسجتہ العنکبوت

لقد یکفید فیھا　　ایھا العاقل قوت

ولعمری عن قریبٍ　　کل من فیھا یموت

یعنی یقیناً یہ دنیا فنا ہے اور دنیا کے لئے ثبات نہیں اور دنیا اس گھر کی مانند ہے جو مکڑی نے بنایا ہے۔ اے عقلمند آدمی اس میں تیرے لئے خوراک ہی کافی ہے ۔مجھے اپنی حیات کی قسم ہے ہر ایک جو اس میں ہے مریگا۔

علاوہ بریں چونکہ انسان ادنیٰ حیوانات میں سے نہیں ہے بلکہ صاحب روح اور صاحب عقل وادراک ہے وہ ہر گز ہر گز اشیایِ محسوسہ سے حقیقی راحت حاصل نہیں کرسکتا ۔ اگر بفرض محال یہ جسمانی وشہوانی خوشیاں دائمی بھی ہوتیں توپھر بھی ان سے انسان کی زندگی کے روحانی اوراعلیٰ پہلو کی ہر گز ہر گز تسکین نہ ہوتی۔ جو لوگ دنیا میں ان ادنیٰ خوشیوں میں مشغول ہوتے ہیں اوران کو حسب خواہش حاصل کرتے ہیں وہ بھی آخر کار ان سے تنگ آجاتے ہیں ۔ اگرچہ بعض اوقات ان کے ایسے غلام بھی بن جاتے ہیں کہ ان کی زنجیروں کو توڑ کرآزادہونا ان کے لئے محال ہوجاتاہے ۔ اگر یہ سچ ہے کہ اس چندروزہ زندگی میں ان شہوتوں کی غلامی انسان کی برداشت سے باہر ہوجاتی ہے تو اس بات کا یقین کرنا غیر فانی روحِ انسانی بہشت میں ابد آلاباد تک ان سے مسرور ہوگی بالکل ناممکن ہے۔ لوگ جس قدر ان جسمانی شہوات میں مصروف ہوتے ہیں اسی قدر ذلیل اورخدای تعالیٰ کی اقدس وپاک ذات سے جسے ہر طرح کی ناپاکی وخباثت سے نفرت ہے دور ہوتے چلے جاتے جاتے ہیں۔ جب لوگ اپنے آپ کو شہوت ونفس پرستی کے حوالہ کردیتے ہیں توآخر کار ان کو اپنے ذاتی تجربہ سے یہ حقیقت معلوم ہوجاتی ہے کہ دلی راحت واطمینان اور خرمی وشادمانی حاصل کرنے کی جگہ انہوں نے اپنی بے چینی اور بے قراری کو بڑھادیا اور اپنی روح وضمیر پر ایسے داغ اور دھبے لگادئیے جو توبہ کے آنسوؤں سے بھی دھل نہیں سکتے اوراپنے آپ کو ایسے دکھ میں ڈال دیا جو ہمیشہ ان کو لرزاں وترساں رکھتا اور خدا کے عذابِ عظیم کی صورت دکھاتاہے ۔ چنانچہ حافظ نے خوب کہاہے ۔

مرادِ منزل جانان چہ جای عیش چون ہر دوم　　جرس فریاد میدارد کہ بربندید محلہا

خدایِ عادل کا غضب جو گناہ کے خلاف بھڑکتاہے اس کے خیال سے لوگ مایوس ہوجاتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ "ہمہ جادوش بدوش اند مکافات

وعمل "ان کا ضمیر خود ان کو قائل کرتاہے اور مجرم ٹھہراتا ہے اگرچہ شیطان ان کو یہ کہکر فریب دیتا ہے کہ خدا سزا نہیں دیگا۔ جسمانی اور روحانی دکھ درد اور رنج وغم سے ان کو اس بات کا کافی ثبوت مل چکا ہے کہ گناہ اپنی سزا اپنے ساتھ لاتاہے۔ حضرت علی نے کہا ہے حلاوت دنیاک مسمہ فلاتا کل الشھد الابسمہٖ یعنی تیری اس دنیا کی حلاوت میں زہر ملاہے۔ پس توشہد کو زہرے کے ساتھ کھاتا ہے۔

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ ان کی خوشی اور شادمانی کا دارومدار دینوی دولت کے حصول پر ہے۔ وہ کثرت سے مال جمع کرتے ہیں۔ جس قدر زیادہ جمع کرتے ہیں اسی قدر زیادہ ان کی حرص بڑھتی جاتی ہے اور کسی چیز سے ان کی تسکین نہیں ہوتی۔ آخر کار موت ان کو آپکڑتی ہے اور انکے تمام اندوختہ کو ان سے چھین لیتی ہے۔ یہاں تک کہ جوانی کے دنوں میں بھی زندگی کا کچھ ٹھکانا نہیں یقین بات فقط موت ہی ہے۔ یرید الفتی الایموت خلیلہ ولیس الی ان لایموت سبیل یعنی جوان آدمی چاہتا ہے کہ اس کا دوست نہ مرے اور نہ مرنے کی کوئی راہ نہیں ہے۔

اپنے تمام خزانوں کو چھوڑ کر اور آئندہ کی امید سے خالی ہو کر ننگے اور مایوس اس سرای فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف سے روانہ ہوتے ہیں۔ جنہوں نے دولت پر بھروسہ کیا ان کے کانوں میں مرتے وقت اس قسم کی صدائیں آتی ہیں "اے دولتمندو اب تم جاؤ اور اپنے اوپر آنے والی مصیبتوں سے آہ ونالہ کرو۔ تمہاری دولت ناپاک ہے اور تمہاری پوشاک کرم خوردہ ہے تمہارے سونے چاندی کو زنگ لگ گیا ہے اور یہ زنگ تمہارے خلاف شہادت کا کام دیگا اور تم کو آگ کی طرح کھاجائیگا۔ تم نے آخری دنوں میں مال جمع کیا۔ دیکھو جن مزدوروں نے تمہارے کھیت کاٹے تم نے دغا سے ان کا حق چھین لیا اور تمہارے کھیت کاٹنے والوں کا چلانا سبت کے خداوند کے کان تک پہنچا ہے۔ تم نے زمین پر بہت عیش وعشرت سے زندگی بسر کی ہے اور اپنی خوشی حاصل کرچکے ہو۔ تم نے قتل کے روز اپنے دلوں کو خوب آسودہ کیاہے۔

دولت کا حصول ہمیشہ بے رحمی ودغابازی اور ظلم ہی سے نہیں ہوتا لیکن انسان کی روح اس سے آسودہ نہیں ہوتی اور خواہ کیسے ہی اچھے وسائل سے دولت حاصل کی جائے مرتے وقت کوئی اسے نہیں لے جاسکتا۔ موت ہم کو اشیایِ عالم کی حقیقی صورت دکھلاتی ہے اور ہم ان اشیا کی بے حقیقی کو دیکھتے اور سمجھتے ہیں جن کی لوگ نہایت سرگرمی سے جستجو کرتے ہیں چنانچہ مثنوی شریف کا یہ شعر خوب مشہور ہے

مرگ ہر یک ای پسر نگ اوست   پیش دشمن و بردوست دوست

پھر یوں بھی مرقوم ہے:

کہ کردور ہمہ عالم کمان ظلم بزہ   کہ تیر لعنت جاوید را نشانہ نشد؟

پھر بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو انسانی علم کے حصول سے حقیقی سعادت وخوشحالی کی امید رکھتے ہیں۔ وہ اس امر پر کافی غور نہیں کرتے کہ انسان

نے اشیاءِ عالم کے بارہ میں جو کچھ سیکھاہے چونکہ اس کی بنیاد فانی اشیا پر ہے لہذا وہ بھی فنا ہوجائیگا۔ انسان کی روح غیر فانی ہے اور فانی علم سے ہرگز ہرگز اس کی دائمی تسکین نہیں ہوسکتی کیونکہ شاعر کھتا ہے:

فہم وخاطر تیز کرون نیست راہ　　جز شکستہ می نگیر وفضل شاہ

اسی لئے یوں مرقوم ہے کہ " اگر انسان خیال کرتا ہے کہ وہ کچھ جانتا ہے توجیسا کہ اسے جاننا چاہیے نہیں جانتا لیکن اگر کوئی خدا سے محبت رکھتاہے تواسے جانتا ہے"۔

بعض یوں بھی سوچتے ہیں کہ دنیوی عزت اور جاہ وجلال سے ان کو سعادت وراحت نصیب ہوگی اور بعض اور طرح طرح کے وسیلوں سے آرام کی تلاش کرتے ہیں لیکن تمام بنی آدم راحت وآرام اور دلی اطمینان کی تلاش میں متفق ہیں مگر جن طریقوں کا ہم ذکر کرچکے ہیں اور ایسے ہی اور طریقوں سے کبھی کوئی منزلِ مقصود کو نہیں پہنچ سکتا۔ یہ بھلا کب ممکن ہوسکتا ہے کہ انسانی غیر فانی روح اس جہان فانی کی فانی لذات وشتہیات سے تسکین حاصل کرے؟ چنانچہ شیخ سعدی نے فرمایا ہے:

جہان ای برادر نماکبس　　دل اندرجہان آفرین بندو بس

مکن تکیہ برملک دنیاو پشت　　کہ بسیار کس چو نتوپروردو کشت

فقط اسی سے جو غیر فانی اور باقی ہے انسان کی غیر فانی روح کی تسکین ہوسکتی ہے لہذا خدای حی القیوم کے عرفان میں اوراپنی مرضی کو اس کی پاک مرضی کے تابع کرنے ہی میں آرام ودلی اطمینان حاصل کرسکتے ہیں۔ پس ہر ایک جو اس ازلی وابدی دولت کو حاصل کرنا چاہتاہے (جس کے بغیر قارون باوجود اپنے بیحد زرومال کے تہید ست تھا) اور جو کوئی اس لازوال سعادت کے حصول کا آرزومند ہے اسے لازم ہے کہ سب سے پہلے اس ازلی وابدی نیک بختی کے سر چشمہ یعنی خدای تعالیٰ کو تلاش کرے اوراپنے خالق ومالک کی ملاقات سے محفوظ ہو کیونکہ سب سے اعلیٰ وافضل راحت اور دنیا وعاقبت کی نیک بختی اس لازوال کے وصال پر موقوف ہے جس کے ہم جویان اور خادم ہیں۔ اسکے وصال سے بڑھ کر کوئی نیک بختی وخوشحالی متصور نہیں ہوسکتی۔

بنی آدم کو خلق کرنے کی علت غائی یہ ہے کہ وہ خدای عزوجل اور رحیم ورحمان کو جانیں اوراس کی خوشنودی حاصل کریں۔ نہ یہ کہ فنا پذیر مواشی کی مانند اپنے تئیں کھانے پینے اور شہوات کے پورا کرنے میں مصروف رکھیں یا فانی اور زوال پذیر دولت کے خزانے جمع کریں اوراپنے ابنای جنس کی نظروں میں عزت وحرمت کے حصول میں مشغوف ہوں۔ بخلاف اس کے انسان اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ اپنے قادرِ مطلق خالق کا عرفان حاصل کرے اور دلی عزت واخلاص کے ساتھ اس کی خدمت کرے جس کی بندگی ہر طرح کے گناہ اور شیطان کی غلامی سے حقیقی آزادگی بخشتی ہے۔ کیونکہ مخلوق کے لئے ازلی وابدی نیک بختی کے حصول کی یہی ایک راہ ہے۔ پس لازم ہے واجب ہے کہ جب تک ہم اس دنیا میں ہمیشہ اپنی ہستی کی اس علت غائی کو مدِ نظر اورملحوظ خاطر

رکھیں اور جب تک اسے حاصل نہ کریں ہر گز ہر گز آرام نہ لیں۔ جو کوئی ان اہم امور پر غور وفکر نہیں کرتا بلکہ اس زندگی کے بیش بہاوقت کو محض دنیاوی وجسمانی لذات کی جستجو میں ضائع کرتاہے وہ خدا کی غضب سے کیسے نجات پائیگا؟

لیکن ازلی وابدی خداوند کا عرفان کیونکر حاصل کریں اور اس نادیدنی اور بعید الفہم کو کیونکر جانیں؟ کیا یہ فقط ہماری عقلی قوتوں کے وسیلہ سے جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں ممکن ہے؟ چنانچہ ایک عربی شاعر کہتا ہے

کیفیة المرلیس المریدرکھا   فیکف کیفیة الجبار فی القدم

ھوالذی انشاء الاشیاء مبتدعا   فیکف یدرکہ مستحدث النسم

یعنی انسان انسان کی کیفیت کو نہیں جانتا۔ پس کیفیت خدا تواور بھی اعلیٰ ہے وہ تمام چیزوں کا موجود اور ظاہر کرنے والا ہے۔ پس فانی متنفس کیونکر اس کوجان سکتاہے؟

اس ازلی وغیر متغیر خالق کا ہماری ناقص ومحدود عقل میں آنا ناممکن ہے ۔ اس کی ذاتِ اقدس کی ابتدا وانتہا ہر دوہمارے خیالات سے خارج اور بالاوبرتر ہیں۔ اگرچہ حضرت ایوب اپنی دانائی کے مقابلہ میں اپنے صبر کے سبب سے زیادہ مشہور ہیں تو بھی اس مضمون پر انہوں نے فرمایا ہے" کیا تو تلاش کرنے سے خدا کو پاسکتاہے؟ کیا تو قادرِ مطلق کو پورے طور سے دریافت کرسکتا ہے؟ وہ آسمان کی مانند بلند ہے۔ تو کیا کرسکتا ہے؟ وہ پاتال سے بھی عمیق ہے۔ تو کیا جان سکتاہے؟"

اس میں شک نہیں کہ الہام ومکاشفہ کے بغیر بھی انسان موجودات اوراپنی ذات کے وسیلہ سے خدا کے بارے میں کچھ علم حاصل کرسکتاہے۔ مثلاًوہ یقینی طور پرجان سکتاہے کہ خدا ہے اور تمام زمین وآسمان اورمافیہا سے بالاوبرتر ہے اوراس کی دانائی لامحدود اوراس کے طریق عمل دریافت سے باہر ہیں لیکن اسطرح سے انسان کبھی اس کو ایسے طور سے نہیں جان سکتا جیسے آدمی اپنے دوست کو جانتا ہے یا بچہ اپنی ماں کو ۔انسان یہ بھی معلوم کرسکتا ہے کہ خدای تعالیٰ مہربان ہے اور اس کا رحم اس کے تمام افعال سے عیاں ہے چنانچہ شاعر نے سچ کہا ہے:

"حق ہزاران صنعت وفن ساختست   تاکہ مادر برتو مہر انداختست

پس حق حق سابق ازماور بود   ہر کہ این حق رانداند خربود"

جو قدرت سیاروں ستاروں کو ان کے مداروں پر باقاعدہ گردش کراتی ہے اس پر غور کرنے سے اور جس دانائی نے ایک مخلوق کو دوسرے مخلوق سے باہمی امداد ومساعدت کے رابطوں سے مربوط رکھا ہے۔ اس پر سوچنے سے اور نیز اس احتیاط وپیش بینی پر نظر کرنے سے جس نے ہر ایک حیوان کو ان اعضا اور اوزار سے مسلح کیا ہے جن سے اس کی زندگی قائم رہتی ہے اور افعال وقوع میں آتے ہیں انسان اس عظیم الشان خالق کی صفاتِ جلیلہ اور عنایات واخلاق کا کچھ

تھوڑا سے علم حاصل کرسکتا ہے ۔ اسی لئے حضرت داؤد نے ۹۴ویں زبور کی نویں اور دسویں آیات میں یوں فرمایا ہے" وہ جس نے کان لگایا کیا نہیں سنتا؟ وہ جس نے آنکھ بنائی کیا نہیں دیکھتا؟ وہ جو قوموں کو تنبیہ کرتاہے کیا سزا نہ دیگا؟وہ جوانسان کو دانش سکھاتا ہے کیا واقفیت نہیں رکھتا؟"

مخلوقات کی بلند آواز انسان کو یہ سکھانے کے لئے کافی ہے کہ خدای تعالیٰ قادر مطلق اور علیم ورحیم ہے ۔ضمیر اور عقل کے وسیلہ سے خدای تعالیٰ نے انسان کو عطا کی ہے آدمی اس قابل ہونا چاہیے کہ حق و باطل اور انصاف وبے انصافی میں تمیز کرسکے اور یہ جان سکے کہ خداوند کریم کن باتوں سے خوش ہے اور کونسی باتیں اس نا پسند ہیں۔ انسان کو یہ بھی بخوبی سمجھنا چاہیے کہ انصاف الہیٰ بدی کی سزا اور نیکی کی جزا کا متقاضی ہے اور جس خدا نے انسان کی روح کو ان باتوں کی تمیز کی قابلیت بخشی ہے وہ ضرور عادل اور پاک ہے اس لئے نیکی کی جزا اور بدی کی سزا دیتا ہے ۔ کم سے کم یہ سب باتیں انسان خدا کی پاک مرضی اوراس کی صفات کے متعلق اپنی عقل اور ضمیر کے وسیلہ سے سیکھ سکتا ہے۔ لیکن تجربہ ہم کو صاف طور سے یہ سکھاتاہے کہ انسان نے الہام الہیٰ کے بغیر ایسا نہیں کیا۔ بیدین لوگوں کا وجود اس امر کی بین دلیل ہے۔ اگرچہ ان میں سے بہت سے بڑے بڑے عالم اور عاقل وتیز فہم توبھی تمام گذشتہ زمانوں میں اور زمانہ حال میں ایسے لوگ ہند وچین اوردیگر ممالک میں بُت پرستی میں غرق رہے ہیں اورانہوں نے کبھی اسبات کو نہیں پہچانا کہ خدای تعالیٰ واحد، زندہ ، ازلی ، علیم قادر مطلق اور پاک ہے اور زمین وآسمان اور تمام دیدنی اور نادیدنی اشیاء کا خالق ہے۔ مختلف ممالک میں یکے بعد دیگرے بہت سے مذاہب برپاہوئے اوراگرچہ ان میں سے اکثر میں خدا کا خیال اوراس کی عبادت کی ضرورت کا اقرار پایا جاتا ہے توبھی بنی آدم کو شیطان نے گمراہ کردیا اور اپنی خواہشوں کے فریب میں آکر انہوں نے سیاروں ستاروں اور بُتوں کی پرستش کی یہاں تک کہ مردوں اور درندوں کی عبادت میں مبتلا ہوگئے اگرچہ انسان بعض باتوں کو اپنی عقل کے ذریعہ سے سمجھ سکتا ہے تو بھی اسے اپنی عقل کی درستی اور اصابت کا یقین نہیں ہوتا اوراسکے خیالات میں یہ پریشانی باقی رہتی ہے کہ کس بات کو مانے اور کون سی بات کو عمل میں لائے؟ یہاں تک کہ یونان کے بڑے مشہور فیلوسف افلاطون اور ارسطاطالیس اگرچہ لوگوں میں بڑے دانا سمجھے جاتے تھے توبھی انہوں نے خدای تعالیٰ ک شخصت اور وحدانیت کو نہ جانا اوراس کی ذات اقدس کی قدوسیت کو مطلق نہ سمجھا۔

حقیقت ہے کہ انسان کے اعتقاد اور اعمال پر فقط اس کی عقل ہی اکیلی تاثیر کرنے والی نہیں ہے بلکہ وہ شہوانی طبعیت بھی رکھتاہے اور جسمانی خواہشوں نے اس پر ایسا غلبہ حاصل کیاہے کہ بسا اوقات اس کی چشم ادراک کو اندھا کردیتی ہیں۔ اس سبب سے بھی انسان اپنی عقل کے زور سے اس عرفان الہیٰ کو جس کا ہم نے ذکر کیا ہے نہ کبھی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے اپنی قوت

وقدرت سے وہ کبھی اپنی خواہشات پر غالب نہیں آیا اور جس بات کو درست
ماننا بھی تھا اسے عمل میں لانے کے لئے رضامند نہیں ہوا۔

بفرض محال اگر مان بھی لیا جائے کہ انسان فقط اپنی عقل ہی کے زور
سے عرفان الہیٰ کے اس مذکورہ بالا درجہ کو حاصل کرسکتا ہے تو بھی خدا کی ذات
وصفات کے متعلق اس درجہ کا عرفان ہماری دلی آرزو کو پورا کرنے کے لئے ہر
گز ہرگز کافی نہیں ہے کیونکہ انسان اپنی محدود عقل کے اخذ کردہ نتائج پر پورا
بھروسہ نہیں کرسکتا اوراس کا سبب یہ ہے کہ بڑے بڑے دانا جنہوں نے ان
امور پر بہت غووخوض کیا ہے باہم متفق الرای نہیں ہیں۔ لہذا انسان کے دل
میں شکوک پیدا ہوتے ہیں اوروہ ان کے سبب سے ہمیشہ بے چین رہتا ہے ۔
عقل کے زور سے انسان یہ بھی پورے طور سے نہیں جان سکتا کہ خدا کی مرضی کیا
ہے اور اس کے احکام کیا ہیں اور آدمی خدا کو کس طرح سے خوش کرسکتا ہے۔ پس
انسان خدا کی مرضی کو کس طرح سے عمل میں لاسکتا ہے ؟ اوراس کے سوا اور
کیونکر اپنے خالق کو خوش کرسکتا ہے ؟ اور جب تک خدا کا منظورِ نظر نہ ہو حقیقی
نیک بختی اور سعادت کو کیونکر حاصل کرسکتا ہے ؟

پس صاف ظاہر ہے کہ الہامِ الہیٰ کے وسیلہ سے انسان کے شکوک
دورہوسکتے ہیں اور اس کو دلی اطمینان حاصل ہوسکتا ہے کیونکہ الہام ہی انسان کو
تذبذب کے گرداب سے نکال کر ساحل یقین پر پہنچاتا ہے اور دلی اطمینان بخشتا
ہے۔ الہام ہی کے وسیلہ سے وہ جان سکتا ہے کہ خدا کو کس طرح خوش کرے اور
ابدی آرام کی منزل مقصود پر پہنچے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ خدای تعالیٰ
نے جبکہ انسان کے دل میں ازلی نیک بختی کی آرزو اور دلی آرام واطمینان کی
خواہش رکھدی ہے تواس کا انتظام بھی کیا ہے کہ انسان جستجو کرکے اپنے مراد
کے حصول سے فائدہ المرام ہو کیونکہ یہ خیال بالکل ناممکن ہے کہ رحیم ورحمان
خدا نے اس پیاس کو پیدا کردیا اوراس کے بجھانے کے لئے آبِ حیات مہیا نہ
کیا۔ پس چونکہ بنی آدم کے عالمگیر تجربہ سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ انسان
الہام کی مدد کے بغیر اپنی مراد کو نہیں پہنچ سکتا لہذا تمام اصحاب فہم وفراست
کی نظر میں ضرورت الہام اظہر من الشمس ہے کیونکہ جو لوگ الہام کو غیر
ضروری سمجھتے اور خیال کرتے ہیں کہ انسان محض اپنی محدود عقل کی رہنمائی
سے خدای تعالیٰ کو پہچان سکتا ہے اور اس کی پاک مرضی کو دریافت کرسکتا ہے
اورخدا کو خوش کرکے ازلی نیک بختی وسعادت حاصل کرسکتا ہے اس حقیقت
سے بے خبر ہیں کہ ہر زمانہ میں بہت سے داناؤں نے خیالات کے بحر بے پایاں
میں غواصی کی ہے اوران میں سے ایک بھی ایسا نہیں جسے گوہر مقصود ہاتھ لگا ہو۔
ملکِ یونان اور بہت سے دیگر ممالک کے حکمای قدیم نے زمانہ بہ زمانہ اپنی دانائی
کے زور سے معمای دہر کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن ان میں سے ایک بھی الہی
ہدایت کے بغیر کامیاب نہیں ہوا۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے:

ہیچ کس عقدہ از کارِ جہان باز نہ کرد   ہر کہ آمد گرہے چند بریں تار فزود

فی الحقیقت انسانی عقل کی دھندلی روشنی جہالت کی تاریک اور شکوک کے گھنے جنگلوں اور خطاکاری کی گہری دلدلوں میں سے انسان کو سلامتی کے ساتھ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتی۔ سالک راہِ خدا فقط کلام اللہ ہی کے آفتاب کے نور کی ہدایت ورہبری کے وسیلہ سے اپنی منزلِ مقصد تک پہنچ سکتا ہے اورخدای تعالیٰ نے کمال فضل وکرم سے ایسا الہام بنی آدم کو عنایت فرمادیا ہے تا کہ اس کے وسیلہ سے ان کی وہاں تک رسائی ہو جہاں اپنی عقل کی مدد سے ہر گز ہر گز نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس الہام میں اللہ جلشانہ نے بنی آدم کے حق میں اپنی مرضی کا صاف اظہار کردیا ہے اور راہِ نجات کو ظاہر فرماکر عرفانِ ایزوی اورازلی مبارکبادی کے حصول کے وسائل نہایت صفائی اور صراحت کے ساتھ دکھلادیئے ہیں۔ اس بے بیان بخشش کے لئے خدا کا شکر ہو!

لیکن دنیا میں بہت سے مذاہب موجود ہیں اوران میں سے ہر ایک مذہب الہامِ ایزوی کے موافق ومطابق ہونے کا مدعی ہے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ تمام مذاہب خدای واحد وبرحق کی طرف سے نہیں ہوسکتے کیونکہ بہت سی باتوں میں وہ باہم متناقض ہیں۔ ان میں سے بعض کی تعلیم یہ ہے کہ بہت سے خدا ہیں اور بعض بُت پرستی کو جائز قراردیتے ہیں اور بعض ان دیوی دیوتاؤں کے سامنے انسانی قربانی کا حکم دیتے ہیں جو کہ بے رحم اور گناہ وشہوات میں مصروف ومسرور ہیں۔ بے شک متفکرِ حق کو ہر حق کو گم شدہ اور بطالت کی دلدل میں پوشیدہ پائیگا اوراسی لئے ممکن ہے کہ بعض اوقات باطل مذاہب ہیں حق وراستی

کے بعض نشانات ہم کو نظر آئیں۔ مثلاً تمام مذاہب اس تعلیم میں متفق ہیں کہ موت کے بعد زندگی ہے جس میں وہ سزا وجزا وقوع میں آئیگی۔ نیز اس امر میں کہ دعا کرنا اوراحکام الہیٰ کو بجالانا چاہیے۔ لیکن پیش از انکہ گوہر یوز آفتاب میں درخشاں سو اس کو تمام میل کچیل سے صاف وپاک کرنا ضروری ہے جب تک کیچ میں پوشیدہ اورآلائیش سے آلودہ ہے بے فائدہ ہے۔ تمام راستی خدا کی طرف سے ہے اور شاید اس زمانہ کے نور کی چند شعاعیں جبکہ آدم خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا اب تک بیدین لوگوں کے دلوں کی تاریکی میں ٹمٹمارہی ہیں لیکن یہ فقط تاریکی کو دکھاتی ہیں اور گمراہ کے دل میں الہام ایزدی کی پوری روشنی کی خواہش کو مشتعل کرتی ہیں۔

دنیا کے بڑے بڑے مذاہب میں سے زمانہ حال میں فقط دوہی ایسے ہیں جو توحید باری کی تعلیم دیتے ہیں کیونکہ یہودی دین کے پیروکار بہت ہی تھوڑے لوگ ہیں اور وہ سب کے سب ایک ہی خاندان کے سٹرکا ہیں۔ بڑے موحد دینِ اسلام اور دینِ عیسوی ہیں لیکن یہ اگرچہ بعض باتوں میں متفق ہیں تو بھی بہت سے امور ہیں ان میں باہمی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اہل اسلام کہتے ہیں کہ ایں کہ اسلام کشادہ راہ ہے اور دین عیسوی تنگ راستہ ہے۔ اس میں مسیحی لوگ ان سے متفق ہیں لیکن کہتے ہیں کہ فقط تنگ راستہ ہی حیات کی طرف لے جاتا ہے(متی ۷: ۱۳، ۱۴) یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ دونوں راہیں مخالف اطراف کوجاتی ہیں۔ لہذا یہ دونوں بنی آدم کو خدا کی طرف نہیں لے جاتیں فقط ایک ہی

ان میں سے ایسی راہ ہوسکتی ہے جوخدا کے حقیقی عرفان تک پہنچاتی ہے اور اس ازلی نیک بختی تک لے جاتی ہے جس کے ہم مسیحی اور مسلمان آرزوہند ہیں۔ پس ہر ایک حقجو اس امر کی تحقیقات میں مصروف ہوگا کہ ان دونوں میں سے کون سی راہ درست ہے تاکہ وہ اسے اختیار کرکے اپنی منزلِ مقصود کو پہنچے۔ اس معاملہ میں قومی اور دینی تعصب سے دست بردار ہونا چاہیے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ آنکھیں پر پردہ ڈال دے اور لوگ نورِخدا کو دیکھنے سے محروم وبے بہرہ رہیں۔

پس اس حالت میں ہمیں دریافت کرنا چاہیے کہ وہ کونسی علامات ہیں جن کے وسیلہ سے ہم ان دونوں راہوں میں سے راہِ نجات کو یقینی طورپر پہچان سکیں؟ اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ سچے الہام اور عرفان الہیٰ کی راہ کے ثبوت بآسانی بہم پہنچ سکتے ہیں بشرطیکہ ہم انسانی روح کی آرزوؤں پر غور کریں انسانی ضمیر کے تقاضوں پر سوچیں اور خدایِ واحد وبرحق کے اخلاق اوراس کی صفات کے بارے میں ضمیر کی شہادت کو جانچیں خصوصاً جبکہ اس کے اخلاق اور اس کی صفات کا اس کی مخلوقات میں کسی قدر مکاشفہ ہوچکا ہے ۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی پاک ذات تغیر وتبدل سے بالکل پاک ہے۔ لہذا خدا تعالیٰ کی ذات اورمزاج کا مکاشفہ سے بالکل مطابقت رکھے جس کے وسیلہ سے اس نے اپنے تئیں مخلوقات کے کاموں میں تمام کائنات کی حفاظت اور ضمیر کی آواز میں ظاہر فرمایا ہے یعنی اگرچہ یہ سچ ہے کہ حقیقی الہام میں خدا کی ذات اور مرضی کے بارے میں اس سے بہت زیادہ آگاہی ہوگی جو کہ انسان تواریخ کائنات اوراپنے دل کی آرزوؤں کے مطالعہ سے سیکھ سکتا ہے توبھی یہ الہام اس شہادت کے خلاف نہیں ہوسکتا جو تمام فطرت اور ضمیر سے خالق کے حق میں ملتی ہے۔لہذا حقیقی اور سچا الہام دنیا کے تمام دیگر مذاہب سے مفصلہ ذیل چھ نشانات کے ذریعہ سے تمیز کیا جاسکتا ہے۔

اول۔ واجب ولازم ہے کہ سچا الہام ازلی نیک بختی کے حصول کے متعلق انسانی روح کی آرزوؤں کو پورا کرے۔ یہ آرزوئیں تین طرح کی ہیں۔

(۱) عرفان حق کی خواہش (۲) معافی کی آرزو(۳) پاکیزگی کی خواہش۔

(۱۔) انسان اپنی نسبت اوراپنے خالق کے بارے میں حقیقتِ حال کے علم کا محتاج ہے یعنی وہ خدا کی ذات وصفات اور مرضی واحکام کے بارے میں قابل اعتماد آگاہی چاہتاہے۔ پھر وہ یہ جاننے کا محتاج ہے کہ اس کی تخلیق کا مقصد کیا ہے اور وہ مقصد کیونکر پورا ہوسکتاہے ؟ کیونکہ اگرانسان ان اہم امور سے نادان وناواقف رہے تو حقیقی اور دائمی نیک بختی کو کیونکر حاصل کرسکتا ہے ؟ "خدا کے پاس آنے والے کو ایمان لانا چاہیے کہ وہ موجود ہے اوراپنے طالبوں کو بدلہ دیتاہے"(عبرانیوں ۱۱: ۶)۔

(۲۔) انسان اپنے گناہوں اور اپنی تقصیروں کی معافی ومغفرت حاصل کرنے کا محتاج ہے کیونکہ وہ محسوس کرتاہے کہ خیال اور قول وفعل میں جو

کچھ اسے کرنا چاہیے تھا اس نے نہیں کیا اور جو کچھ کرنا نہیں چاہیے تھا کیا ہے اور اس لئے خدا کی نظر میں گنہگار اور خطا کار ہے۔ ہر ایک شخص جو اپنی اندرونی حالت سے آگاہ ہے اور اپنے تئیں فریب دینا نہیں چاہتا واجب ہے کہ اپنے گناہوں اور اپنی تقصیرات کا اقرار کرے اور یہ دریافت کرے کہ وہ خدا سے اپنے گناہوں کی معافی کیونکر حاصل کرسکتا ہے کیونکہ خدا سب کچھ جانتا ہے۔ اس کے سامنے سب کے دلوں کا حال کھلا ہے۔ وہ تمام آرزوؤں سے واقف ہے اور کوئی راز اس سے پوشیدہ نہیں۔ کیونکہ جس گنہگار کے گناہ معاف نہیں ہوئے وہ خدا کے حضور میں کیونکر جاسکتا ہے اور اس کے رحم کے وسیلہ سے اس فرخندہ فالی اور خوشحالی کو کس طرح حاصل کرسکتا ہے جس کا انحصار خدا کے ساتھ صلح اور اس کی مرضی سے مطابقت پر ہے؟ لہذا گناہ کی معافی ومغفرت کے حصول کا طریقہ حقیقی الہام میں سکھلایا جائیگا۔

(۳۔) لیکن ماضی کے گناہوں کی معافی کے علاوہ انسان اس بات کا بھی محتاج ہے کہ اس کا دل گناہ کی محبت سے خالی اور پاک وصاف کیاجائے تاکہ روز بروز وہ اپنے خالق کی مانند چلاجائے جس نے توراۃ میں حضرت موسیٰ کی زبانی اپنے لوگوں سے کہا " تم مقدس ہو کہ میں خداوند تمہارا خدا قدوس ہوں"(احبار ۱۹: ۲۱) کیونکہ جب تک آدمی کی روح کی یہ آرزو پوری نہ ہو اور اس کا باطن بُری خواہشوں سے بالکل پاک نہ ہوجائے تب تک ناممکن ہے کہ پاک وعادل خدا اس سے خوش ہو اور چونکہ حقیقی نیک بختی اندرونی پاکیزگی سے بہت قریبی رشتہ رکھتی ہے جیسا کہ انجیل شریف میں مرقوم ہے " مبارک ہیں وہ جو پاک دل ہیں کیونکر وہ خدا کو دیکھینگے"(متی ۵: ۸) اس لئے صاف ظاہر ہے کہ دلی اور روحانی پاکیزگی وتقدیس کے بغیر کوئی فرد بشر اس جلالی رویا یعنی دیدارِ خدا کا حقدار نہیں ہوسکتا۔

انسانی روح کی یہ تینوں آرزوئیں اس کی ازلی نیک بختی کے حصول سے مربوط وابستہ ہیں لہذا جب تک انسان کو عرفانِ حق حاصل نہ ہو اور خدا کی نظر میں راستباز نہ ٹھہرے اور اندرونی پاکیزگی کو حاصل نہ کرے تب تک ناممکن ہے کہ خدای قدوس کی پاک حضوری میں روحانی مبارک بادی سے محظوظ ہو۔

اس مقام پر یہ بھی یاد رہے کہ یہ روحانی اوردلی تسکین کی آرزو بے دین اقوام کے افراد میں بھی پائی جاتی ہے کیونکہ وہ بھی مانتے ہیں کہ ان کو دائمی خوشحالی حاصل کرنے کے لئے عرفانِ حق کی ضرورت ہے۔ ان کا قربانیاں گذراننا اس امر کی نہایت پختہ اور قاطع دلیل ہے کہ وہ اپنے آپ کو گنہگار مانتے ہیں کیونکہ وہ معافی ومغفرت حاصل کرنے کے لئے قربانیاں گذرانتے ہیں۔ ان کے کثیر التعداد ومختلف مجاہدات اوران کی نذریں بھی نہایت صفائی سے ثابت کرتی ہیں کہ جو ناپاکی اور آلودگی ان کواس گناہ آلودہ دنیا میں لاحق ہو گئی ہے وہ اس سے اپنے دلوں کو اوراپنی روحوں کو پاک وصاف کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

جب تک یہ ابدی نیک بختی ہے کہ آرزوجو خداوند کریم نے انسان کے دل میں رکھدی ہے پورے طور سے پوری نہیں ہوتی تب تک صاف ظاہر ہے کہ انسان سچی خوشی اور دلی اطمینان حاصل نہیں کرسکتا کیونکہ خوف وشکوک کی امواج کے تلاطم میں اور خواہشات کی طغیانی کے درمیان انسانی روح کی کشتی کو کس طرح قرار ہوسکتا ہے؟ یہ امر مسلمہ ہے کہ کوئی فرد بشر نفسانی خوشیوں یا عقلی استدلال کے وسیلہ سے اپنی روحانی تسکین واطمینان کی حالت کو حاصل نہیں کرسکتا۔لہذا اظہر من الشمس ہے کہ خدای تعالیٰ نے انسان کے دل میں یہ آرزواس لئے رکھدی ہے کہ اس کے فضل وکرم کی کثرت سے پوری ہو۔خداوند کریم نے اس تشنگی کی آگ کو اسلئے مشتعل کیا ہے چشمہ آبِ حیات سے کافی مقدار لے کر اسے رفع کیا جائے پس صاف ظاہر ہے کہ الہیٰ الہام سے ان ضروریات کو پورا کرنے کی توقع رکھنا چاہیے کیونکہ الہیٰ الہام کا فقط یہی مقصد ہے کہ انسانی روح کی تشنگی کو رفع کرے۔ لہذا اگر کوئی الہام اس مقصد کو پورا نہ کرسکے تو وہ یقیناً بے سودولاحاصل ہے اوراس کا بے سودہونا اس امر کی کافی دلیل ہے کہ وہ منجانب اللہ نہیں ہے کیونکہ اللہ جل شانہ اپنی الہیٰ حکمت ودانائی سے جن وسائل کو اختیار کرتاہے وہ ہمیشہ مقصود نتائج تک پہنچاتے ہیں اور کبھی ناکامیابی نہیں ہوتی۔

دوم۔ حقیقی اور سچا الہام اس اخلاقی شریعت کے موافق ومطابق ہونا چاہیے جوانسان کے دل پر مرقوم اور ضمیر کے نام سے نامزد ہے۔ضمیر وہ قوت ہے جوانتخاب وارادہ ومراد کے متعلق راستی کو محسوس کرکے محسن قراردیتی ہے اور ناراستی کو مردود ناجائز ٹھہراتی ہے۔ یہ قوت عقل واستدلال کی قوت سے مختلف ہے کیونکہ عقل واستدلال کی قوت اس سے ادنیٰ ہے اور غلطی میں پڑ کر گمراہ ہوسکتی ہے حالانکہ ضمیر کے لئے غلطی اور گمراہی کا امکان ہی نہیں۔ بیشک عقل خدا کا بڑا بھاری انعام ہے اوراس بیش بہا بخشش کی بڑی قدر کرنا چاہیے لیکن پھر بھی عقل مقناطیسی سوئی کی مانند ہے جو عموماً مناسب طور سے قطب کی طرف اشارہ کرتی ہے لیکن اگر لوہے کا ایک ٹکڑا اس کے قریب رکھا جائے تو قطب سے برگشتہ ہوسکتی ہے۔ بخلاف اس کے ضمیر ستارہ قبطی کی مانند ہے جو ہمیشہ قطب کو دکھاتا ہے اورجہاز انانِ جہان کی ہدایت ورہنمائی میں بالکل بے خطاہے بشرطیکہ وہ اسے متواتر دیکھتے رہیں۔ برگشتہ قطب نما کی ہدایت پیروی میں بہت سے جہاز چٹانوں سے ٹکرا کر چوُر چوُر ہوچکے ہیں لیکن ستارہ قبطی کبھی برگشتہ نہیں ہوتا مگر بسا اوقات زمین سے بخارات اور شب دوُر کے بلند ہونے کے سبب سے قطبی ستارہ جہاز ان کی نظر سے غائب ہوجاتاہے لیکن شکوک کا شب ودو اور مایوسی کے بادل ستارہِ ضمیر کو مسافر کی نظر سے ہر گز پوشیدہ نہیں کرسکتے۔ عقل ہمارے اخلاق یا افعال کو اچھے یا بُرے قراردیتی ہے لیکن جیسا کہ بیان ہوچکا ہے انتخاب وارادہ مراد کے متعلق فیصلہ کرنا ضمیر کا کام ہے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ضمیر گمراہ ہوسکتا ہے اور لوگوں کو گمراہ کرسکتاہے فی الحقیقت انکا مطلب یہ ہے کہ فیصلہ کرنے میں انسان غلطی کرسکتاہے۔ وہ غلط فیصلہ اوربے

خطا ضمیر میں تمیز نہیں کرتے۔ ان کے خیال کے مطابق قطب نما اور ستارہِ قطبی میں کچھ فرق نہیں ہے۔ خدا نے ضمیر کا قطبی ستارہ ہر ایک انسان کے دل کے آسمان میں قائم کر دیا ہے تاکہ انسان اس کے وسیلہ سے ہمیشہ راہِ راست کو دریافت کرکے اختیار کرے لیکن اخلاق کی درستی اس وقت معلوم ہوتی ہے کہ جب ضمیر اس ارادہ کو جو تمام افعال کی تہ میں ہے نیک قرار دیتا ہے ممکن ہے کہ انسان مانی مسلیمہ کذاب جیسے جھوٹے نبیوں سے فریب کھائے اور باوجود نیک ارادہ کے خطاکاری میں مبتلا ہو لیکن ایسی حالت میں انسان فقط فیصلہ کرنے میں غلطی کرتا ہے اس سے زیادہ اس کا اور کوئی سبب نہیں۔ انسان کا ضمیر اسے یہ بتلاتا ہے کہ احکام الہیٰ کی بجا آوری اور اس کے انبیاء کی فرمانبرداری اس پر فرض ہے لیکن اس کا غلط فیصلہ اسے خطاکاری میں گمراہ کر سکتا ہے اور ممکن ہے کہ وہ یوں خیال کرنے لگے کہ مانی ومسیلمہ یا المقنع یا حاکمہ خدا کی طرف سے ہیں لیکن ایسے کاذب انبیاء کی پیروی زیادہ تر کسی دنیاوی نفع کی امید میں کرتے ہیں۔ پس اگر انسان راہ راست سے برگشتہ ہو کر آوارہ ہو جائے تو اس میں ضمیر کی خطا نہیں ہے۔ ضمیر کی تعلیمات وتنبیہات کی صحت ودرستی کا ثبوت اس حقیقت سے ملتا ہے کہ قریباً تمام اقوام عالم میں اخلاقی شریعت کے بارے میں عام اتفاق پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ہر فرد بشر کا ضمیر دروغگوئی فریب دہی، زناکاری، دزدی، راہزنی اور خونریزی وغیرہ بد افعال کو مذموم قرار دیتا ہے اگرچہ بعض حالتوں میں جھوٹا مذہب لوگوں کو ایسا گمراہ کر دیتا ہے کہ ان مذکورہ بالا بد افعال کا ارتکاب اگر کسی معلمِ دین یا ثبوت کے مدعی کے حکم سے کیا جائے تو مجرمانہ فعل نہیں ہے۔ بعض حالتوں میں لوگوں نے خیال کیا ہے کہ خدا نے کسی نبی پر اپنی عنایت یوں ظاہر ہے کہ اس کو نہایت بے باکانہ طور پر اخلاقی شریعت کو توڑنے کی اجازت دی۔ ان کے اخلاقی فیصلے مذہبی تعصب کی وجہ سے ایسے غلط ہوگئے ہیں کہ وہ اب اس بات کو سمجھ ہی نہیں سکتے کہ کسی آدمی کو کسی حالت میں خطاکاری کا حق حاصل نہیں ہے۔ ان میں اب یہ احساس باقی نہیں رہا کہ ضمیر کی اخلاقی شریعت حق سبحانہ وتعالیٰ کی ذاتِ پاک کا انسان کے دل میں آئینہ پر عکس ہے۔ جس طرح خدا کی ذات غیر متغیر ہے اسی طرح اخلاقی شریعت بھی جو اسی ذاتِ پاک کا عکس وپرتو ہے ہر طرح سے لاتبدیل ہے۔ مرورازمنہ اس پر کچھ تاثیر نہیں کرتا کیونکہ ازلی وابدی ذات زمانہ سے اثر پزیر نہیں ہوسکتی ۔ یہ وہم کہ خدای تعالیٰ کسی اپنے پسندیدہ انسان پر اپنی خوشنودی کے اظہار وثبوت میں اسے اخلاقی شریعت کو توڑنے کی اجازت دیتا ہے ایسا ہی باطل وبے نیاز ہے جیسا بعض بت پرستوں کا یہ عقیدہ کہ ان کے دیوی دیوتاؤں کی قربان گاہوں پر بے گناہ بنی آدم کا خون بہانا کارِ نیک ہے یا جیسی بعض بے دینوں کی یہ تعلیم کہ جب وہ اپنی بیٹیوں کو متعہ یعنی عاضی نکاح کے وسیلہ سے حرامکاری کے حوالہ کرتے ہیں تو حق سبحانہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے یا جیسا بعض گمراہ وبیدین ہندوؤں کا یہ اعتقاد ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں کو مندروں میں فاحشانہ زندگی بسر کرنے کے لئے نہایت سنجیدگی سے مخصوص کرنے سے

اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرتے ہیں ۔ ضمیر اس قسم کی تمام کارروائیوں کو مذموم ٹھہراتا ہے اور صاف بتلاتا ہے کہ یہ فعال خدا کی نظر میں نہایت مکروہ اور سزا کے لائق ہے۔ اسی طرح ضمیر نیکوکاری ۔ راستی ، اخلاص ، رحم ، شفقت ، پاکیزگی اور انصاف اور تمام دیگر نیک افعال کی تصدیق و تحسین کرتاہے جن کو سب بنی آدم نیک اور خدا کی نظر میں پسندیدہ مانتے ہیں اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ خدای تعالیٰ اپنے فضل کے لامحدود خزانہ سے انکا اجر دیگا۔

پس صاف ظاہر ہے کہ سچے الہام کے لئے واجب ولازم ہے کہ ضمیر کی آواز سے موافقت اوراس کی مدد وتائید کرے کیونکہ جن باتوں کو ضمیر ناراست ومذموم اورخدا کی نظر میں مکروہ اور سزا کے لائق قرار دیتا ہے اس الہام سے ان کا مذموم ٹھہرایا جانا ضروری ہے جو اسی خدا کی طرف سے ہے جس نے بنی آدم کو پیدا کیا اوران کے دل میں ضمیر کو قائم کیا ہے اور سچاالہام چونکہ خدا کی طرف سے ہے جو کہ تمام جہان کا عادل حاکم ہے اس لئے لازم ہے کہ اس سے ان مور کی تائید ہو جن کی تائید ضمیر کرتاہے۔ یہ بات بالکل ناممکن ہے کہ کلام اللہ اس ضمیر کی تردید کرے جو خدا نے ہماری ہدایت کے لئے ہمیں عنایت کیا ہے بلکہ بخلاف اس کے از حد ضروری ہے کہ ایسا الہام ضمیر کے فیصلوں کی تائید کرے اورالہیٰ پیغام کے وسیلہ سے ان کو استحکام بخشے تاکہ لوگ غلطی سے اپنی کمزوروناقص رای کو ضمیر تصور نہ کریں اوراس دنیایِ فانی کی لبھانے والی باتوں اور چیزوں اور شیطان کی آزمائیشوں کے سبب سے گناہ میں مبتلا نہ ہوں۔

سوم۔ چونکہ ضمیر انسان کی روح میں تخت نشین ہو کرہ پکارتاہے کہ خدا پاک اورعادل ہے اور نیکوں کا دوست اور جزادینے والا ہے لیکن بدکاروں کو سزا دیتا ہے اسلئے سچے اور حقیقی الہام کے لئے ضروری ہے کہ اس باری تعالیٰ کو ان سب اوصاف کاموصوف ٹھہرائے اورظاہر کرے ۔ نیز جس طرح ضمیر بنی آدم کو نیکی اور پاکیزگی کے حصول کی ترغیب دیتا ہے اسی طرح سے سچے الہام کو بھی چاہیے کہ بنی آدم کو اس اشرف ترین مقصد ومدعا کی طرف بلائے تاکہ وہ ظاہر وباطن میں ہر طرح سے اپنے خیالات اور اقوال وافعال میں نیک بننے کی کوشش کریں کیونکہ خدا خود پاک وقدوس ہے اوراپنے بندوں میں پاکیزگی چاہتاہے۔

چہارم۔ عقل بآواز بلند پکارتی ہے کہ خدا ایک ہے اور تمام کائنات یقیناً ایک ہی دماغ کی صنعتکاری ہے۔ چنانچہ شیخ سعدی شیرازی نے فرمایاہے

برگ درختان سبزو نظر ہوشیار   ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

اور یہ بھی کسی نے خوب کہا ہے کہ فی کل شی لہ ایۃ دلیل وعلیٰ انہ واحد یعنی ہر چیز میں اس کے لئے ایک نشان ہے اوراس بات پر دلیل ملتی ہے کہ وہ واحد ہے۔ پھر کسی نے یہ بھی خوب کہا ہے۔

ہر گیاہے کہ از زمین روید   وحدہ لاشریک لہ گوید

علاوہ برین عقل سے ہمیں یہ آگاہی بھی ملتی ہے کہ خدایِ تعالیٰ ازلی وقادر مطلق اوراپنی ذات وصفات میں پاک اورہر طرح کے تغیر وتبدل سے منزہ ہے اور نیک

وراستکار ہے اور کائنات کو پیدا کرنے اور قائم رکھنے میں اس کا ایک خاص ازلی ولاتبدیل مقصد ہے۔ پس ضرور ہے کہ حقیقی الہام عقل کی اس شہادت کی تائید کرے کیونکہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے بارے میں اصحاب فہم وفراست پر اس قدر تو ضرور عقل انسانی اور کتاب فطرت کے اوراق میں ظاہر فرمادیا ہے یعنی جب ہم موجودات پر غور سے نظر کرتے ہیں تو صاف عیان ہوجاتاہے کہ خدایِ تعالیٰ واحد وازلی اور قادرِ مطلق وراستکار اور زمین وآسمان کا خالق ہے۔ لہذا جوالہام من جانب اللہ ہے ضرور کتاب فطرت سے مطابقت کریگا کیونکہ اس کا مصنف وہی خدا ہے اور ایسا الہام ضرور ذاتِ پاک کو صفاتِ مذکورہ بالا سے متصف کریگا۔

پنجم ۔ ضرور ہے کہ سچا اور حقیقی الہام راہِ نجات کی صاف ہدایت کرے اوراس مضمون کی تعلیم میں ہر گز ہر گز اختلاف معنوی پیدا نہ ہو۔ یہ ممکن ہے کہ ایسا الہام تھوڑا تھوڑا کرکےزمانہ دراز میں تکمیل واتمام تک پہنچے اوراس لئے ممکن ہے کہ اس میں روحانیت کی تعلیم کے مختلف درجے ہوں اور مختلف حالات کے موافق وقتاً فوقتاً ظاہری رسوم میں تبدیلی ہوتی رہے لیکن یہ باتیں محض فروعات دین سے ہیں۔ ان کو مغز دین نہیں کہہ سکتے ۔ بعد میں مناسب وقت پر مکمل شدہ دانہ پر سے یہ فروعات کے چھلکے گرپڑتے ہیں کیونکہ اگرایسا نہ ہو تو چھلکے دانہ کی تکمیل میں بجایِ مددگار ہونے کے رکاوٹ کا باعث ہونگے ۔ چھلکے کا گرپڑنا اور ردہونا خداکے ازلی ارادہ اوراس کی تدبیر کے تغیر وتبدل کا باعث اورمخالف نہیں ہے اگرچہ بعض کو تہ اندیشوں کوایسامعلوم ہوتاہے بلکہ فی الحقیقت اس سے تکمیل کا جاری رہنا پایا جاتا ہے اوراس سے ہمہ دان خالق کاازلی ارادہ وتدبیر تکمیل کو پہنچتے جاتے ہیں۔ اسی طرح سے جب لڑکا مکتب میں داخل ہوتاہے توپہلے ہر روز اسے حروف تہجی کو مطالعہ کرنا ہوتاہے۔ اسے مکتب میں آنے جانے کے وقت کے متعلق اور تمام دیگر قواعد کا پابند ہونا پڑتا ہے لیکن وہ ان قواعد کی پابندی کی غرض سے مکتب میں داخل نہیں ہوتا بلکہ جس مقصد سے وہ داخل ہوتا ہے اس کے حصول کے لئے یہ قواعد وسیلہ ٹھہرتے ہیں۔ بعد میں جبکہ طالب العلم کافی تعلیم پاچکتا ہے تو ان قواعد کی پابندی اس کے لئے ضروری نہیں رہتی اور نہ اس کو مکتب تعلیم حاصل کرنے کو جانے کی ضرورت ہی باقی رہتی ہے ۔لیکن صرف ونحو کے قواعد بالکل نہیں بدلتے اورجب وہ کسی کالج یا اعلیٰ درجہ کی تعلیم گاہ میں داخل ہوتا ہے تو حروفِ مفردہ اس کے لئے ضمیر ضروری نہیں ٹھہرتے اگرچہ اسے ان کو پہلے کی طرح ہرروز بار بار لکھنا اور نقل کرنا نہیں ہوتا۔اس سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ تعلیم کے ضروری اصول تبدل پذیر اور متضاد ہیں کیونکہ حالات کے بدلنے سے متعلم ان باتوں کی پابندی سے آزاد ہوجاتا ہے جو کہ اگرچہ کسی وقت مفید تھیں مگران کی پابندی میں تعلیم میں ترقی کرنے کے بعد بھی قائم رہنا تضیع اوقات اور ترقی کے خلاف ہے۔ اسی طرح اس دنیا کے بڑے مکتب میں عقل ہم کو یہ سکھلاتی ہے کہ خدایِ علیم ہر گز ہر گز یہ نہیں چاہتا کہ اس کے شاگرد ہمیشہ الہیات کی ابجد خوانی ہی

میں مصروف رہیں اور ترقی نہ کریں اورہمیشہ ظاہری رسوم کی پابندی کرتے رہیں اوراپنے خالق کے عرفان میں جس نے دنیا کو اس غرض ومقصد سے پیدا کیا کہ مخلوق اسے جانے کبھی ترقی نہ کریں۔

جس طرح مکتب میں مبادی العلوم کی کتابوں کی جگہ وہ کتابیں لے لیتی ہیں جو کہ اعلیٰ درجہ کےمطالعہ کی جماعتوں میں سکھائی جاتی ہیں اور کسی طرح سے تخالف وتضاد واقع نہیں ہوتا بلکہ ایک ہی مقصد کے حصول کی تکمیل ہوتی جاتی ہے اسی طرح سے ممکن ہے کہ الہیٰ الہام کے وہ پہلے حصے جوظاہری رسوم سے علاقہ رکھتے ہیں ان کی جگہ بعد کے زیادہ گہری اور روحانی تعلیم کے الہام لے لیں توبھی جس طرح سے طالب العلم کے علم میں ترقی کرنے سے صرف ونحو کے قواعد تبدیل اورمنسوخ نہیں ہوتے اسی طرح سے اخلاقی شریعت اور دینِ حق کے بنیادی اصول والہامی حقائق شاگردانِ خدا کے دوران تعلیم میں تبدیل ومنسوخ نہیں ہوتے۔ علاوہ بریں ہوسکتاہے کہ بہت سی نبی یکے بعد دیگرے الہیٰ مکتب کے معلموں کے طور پر بھیجے جائیں اور ممکن ہے کہ بعد میں آنے والوں میں سے ہر ایک اپنے پیشرو سے زیادہ لوگوں کو عرفان الہیٰ میں ہدایت کرے اور جو الہام اس طرح سے تھوڑا تھوڑا کرکے بتدریج دیا گیا ہو اس میں اس طرح کی تبدیلی پائی جائیگی کہ وہ رفتہ رفتہ ادنیٰ سے اعلیٰ درجہ کی طرف ترقی کرتا جائیگا لیکن ایسی حالت میں ایسا خیال کرنا بالکل خلاف عقل ہے کہ جب طلبا اعلیٰ درجہ کی تعلیم گاہوں میں اعلیٰ علوم کی تحصیل کرچکیں گے توایک نیا استاد آکر ان سے یہ طلب کریگا کہ جو کچھ انہوں نے تحصیل کی ہے اس سے بالکل دست بردار ہو کر از سر نوابجد خوانی شروع کریں۔

پس اب ہم صاف دیکھتے ہیں کہ سچے اور حقیقی الہام کی تعلیمات میں باہمی تضاد وتناقض نہیں ہوسکتا اور باوجود اس حقیقت کے ضرور ہے کہ الہامی عرفان الہیٰ کے مکاشفہ میں بتدریج ترقی ہو نہ کہ بخلاف اسکے تنزل۔

کسی کتاب یا نبی سے یہ ہرگز ہرگز نہیں ہوسکتا کہ بنی آدم کو خداوندِ کریم کا پورا یا کامل مکاشفہ عنایت کرے۔ بیشک الہامی کتابیں اورانبیا بنی آدم کو خدا کے بارے میں بہت کچھ سکھاسکتے ہیں۔ ہم ان سے خدا کے احکام۔ اس کی پاک مرضی اوراس کے صفاتِ جلیلہ کے بارے میں سیکھ سکتے ہیں لیکن بنی آدم کو انبیاء اورالہامیٰ کتابوں کے وسیلہ سے ذاتِ باری تعالیٰ سے شخصی واقفیت ہرگز حاصل نہیں ہوسکتی۔ بادشاہ کے اعلان اوراس کے نقیبوں کے الفاظ اس کی عنایات کے فرامین سے اسکی رعایا کو آگاہ کرتے ہیں اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ کیسا مہربان اور عادل ہے لیکن بادشاہ کو پہچاننے اور شخصی طور پر جاننے کے لئے ضرور ہے کہ رعایا اپنی آنکھوں سے اسے دیکھے اوراس کی آواز اپنے کانوں سے سنے۔ اس پر بھی رعایا کا علم بادشاہ کے بارے میں کامل نہیں ہوگا اگرچہ جتناہے حقیقی ہوگا۔ بادشاہوں کے بادشاہ اور تمام کائنات کے خالق ومالک کو جاننے کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ اس کے رسول جو اس کے فرامین کو لاتے ہیں اورہم کواس کے فضل وکرم کی صفات سے واقفیت بخشتے ہیں اس کی

مخلوقات کو اس کی شخصی اور حقیقی واقفیت تک نہیں پہنچاسکتے کیونکہ وہ قادرِ مطلق نادیدہ ہے۔ جو کچھ مرسلین وانبیاء سکھاسکتے ہیں اس کے علاوہ انسان ایک ظاہری مکاشفہ اور مظہرِ ذات الہیٰ کا محتاج ہے جو کامل انسانیت اور کامل الوہیت کا مجموعہ ہو جس کو بنی آدم ایسے شخصی طور سے جان سکیں جیسے اپنے دوستوں کو جانتے ہیں اوراس سے بڑھ کر جو ان کے دلوں میں گھر کرسکے اور ان کو خدا کی عبادت کی طرف لیجائے۔ نہ جزاواجر کی امید سے نہ سزا کے خوف سے بلکہ سچی اور حقیقی محبت کی وجہ سے جو کہ وہ خود غرضی سے پاک اور صفات انسانی میں سے اعلیٰ ترین ہے۔ لہذا سچا الہام ایسے مکاشفہ ومظہر الہیٰ سے بنی آدم کو پہلے ہی سے آگاہ کردیگا تاکہ وہ اس کے اظہار سے پیشتر اس کی آمد کے منتظر ہوجائیں۔ علاوہ بریں حقیقی الہام اس مظہر کی علامات بتائیگا جن کے وسیلہ سے لوگ اسے پہچان سکیں اوراس کی آمد کے بعد اس کے افعال واقوال کو ایسی صفائی سے قلم بند کریں کہ ان سے بعد کے زمانہ کے لوگ اسے ایمان کی آنکھ سے صاف طور سے دیکھیں اورجانیں اوراس کے وسیلہ سے خدای تعالیٰ کو پہچانیں۔

جوالہام ان مذکورہ بالاچھ شرائط کو پورا کرے وہی خدا کی طرف سے اس کے بندوں کی طرف سچا اورآخری الہام کہلانے کا مستحق ہوسکتا ہے ایسے الہام میں ضرور اس قسم کے چند الہیٰ راز بھی ہونگے جو انسانی عقل کی رسائی اورحدِ ادراک سے بعید ٹھہرینگے تاکہ انسان اپنی کمزور عقل کےوسیلہ سے انکی تہ تک نہ پہنچ سکے کیونکہ یہ امر مسلمہ ہے کہ خالق کا علم اوراس کی دانائی انسان کی عقل ودانش سے بے حد اعلیٰ وبالاہیں کیونکہ انسان خاک سے پیدا ہوا اور نہایت کوتہ نظر ہے اور زمانہ کے لحاظ سے گویا وہ کل کا بچہ ہے۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے:

بہ ہامون جلاش خنگ فکرت لنگ وسر گردان   بہ دریای وصالش فکرودانش بے سروماپایان

پس جبکہ حقیقت حال یہ ہے تو انسان کی عقل کنہِ ذات پاک باری تعالیٰ تک کیونکر پہنچ سکتی ہے؟ جبکہ انسان اپنی محدود ذات کو بھی نہیں سمجھ سکتااور اسے کچھ پتہ نہیں کہ آنکھ کس طرح دیکھتی ہے اور کان کیسے سنتا ہے اور ان مادی اور جسمانی آلات کےذریعہ سے اس کی روح جو کہ غیر مادی ہے اپنی اطراف وجوانب کی مادی اور دیدنی اشیا سے کیونکہ رشتہ رکھتی ہے تو نا دیدہ ولامحدود خدا کے رازوں کو کیونکر سمجھ سکتا ہے؟ بلکہ ممکن ہے کہ خدا کی ذات میں ایسی اعلیٰ صفات موجود ہوں کہ افرادِ مخلوقات میں سے کوئی فرد ایسی صفات سے متصف نہ ہو۔ پس انسان اپنی عقل کے زور سے یہ کیونکر معلوم کرسکتا ہے کہ خدا میں فقط یہ یا وہ صفات ہیں اوران کے علاوہ اس میں اور نیک وکامل صفات نہیں ہیں۔ وہ ذاتِ پاک جو کہ خیال ووہم سے باہر ہے اسے کون محدود کرسکتا ہے؟ جو انسان ایسا کرنے کا دعویٰ کرے وہ اپنے لئے الوہیت کا مدعی ہے۔ جو صفات بد اور رذیلہ ہیں اوراس اخلاقی شریعت کے خلاف ہیں جو ہمارے دلوں پر مرقوم ہے اور ذات باری تعالیٰ کا ہمارے آئینہا ہی دل پر عکس ہے) فقط ان کے بارے میں ہم یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ خدا ان سے خالی

ہے۔ مثلاً اگر کوئی کتاب الہامِ خدا ہونے کا دعویٰ کرے اور یہ بیان کرے کہ خدا میں صفاتِ رزیلہ ہیں تو ہم فوراً کہدینگے کہ یہ کتاب الہامِ خدا نہیں ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے بخوبی ظاہر ہے کہ ہر مفروضہ الہام خدا کو کونسے محکِ امتحان سے پرکھا جائے ۔ ایسے محکِ امتحان کو رکھنے اور دانائی وہوشیاری سے استعمال کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اس حقیقت سے صاف ظاہر ہے کہ بہت سی اقوام جھوٹے نبیوں اور جعلی کتابوں کو خدا کی طرف سے فرستادہ تسلیم کرلینے کے سبب سے گمراہ ہوگئیں اور بُت پرستی وبے دینی کے بے آب ولق دوق صحرا میں بھٹک گئیں۔

اگر کوئی بے دین اقوام مذہبی کتابوں کا اس طرح سے امتحان کرے تو اس کو صاف معلوم ہوجائے گا کہ ان کی تعلیمات کا خدای تعالیٰ کی طرف سے ہونا بالکل ناممکن ہے کیونکہ ان کتابوں سے عرفانِ حق ومغفرتِ معاصی اورازلی وابدی نیک بختی کے بارے میں انسان کے دل کی آرزو میں پوری نہیں ہوتی ہیں۔ بے دین اقوام کی ان کتابوں میں ہمہ دان وقادر مطلق خدای مطلق وخالق ومالک کی تعلیمات کی جگہ بہت سے جھوٹے معبودوں کے افسانے مندرج ہیں جن سے لوگ ان کی پرستش کرنا شروع کرتے ہیں اور شرک وبت پرستی اور بہت سے دیگر ناگفتہ بہ گناہوں میں ان ناپاک معبودوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے مبتلا ہوجاتے ہیں۔ پس مذکورہ بالا محکِ امتحانوں یا معیار سے اگر ان اقوام کی مذہبی کتابوں کو پرکھا جائے تو صاف ثابت ہوجائے گا کہ الہام الہیٰ سے نہیں لکھی گئیں اور اس حقیقت سے یہ بات بھی بخوبی ثابت ہوجائیگی کہ جن معیاروں کو ہم نے پیش کیا ہے وہ خاطر خواہ تسلی بخش اور کافی ہیں کیونکر وہ ان باطل مذاہب کا بطلان عیاں کرتے ہیں۔ لہذا دین اسلام اور دین عیسوی کو پرکھنے میں اگر ان معیاروں کو استعمال کریں تو ہم ایک ایسا محک امتحان استعمال کرینگے جو کہ قابل وثوق ثابت ہوچکا ہے۔

اس کتاب کے لکھنے سے ہماری غرض یہ ہے کہ مذکورہ بالا طریق پر تحقیق اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ بنی آدم کی زبان میں مرقومہ کتاب کے اوراق میں جہاں تک خدای تعالیٰ کی ذاتِ پاک کا اظہار ہوسکتا ہے اس کے مطابق کلام اللہ بائبل ہے یا قرآن۔

شاید بعض لوگ یہ خیال کریں کہ بائبل اور قرآن دونوں میں من جانب اللہ ہوسکتے ہیں اور قرآن اس الہام کی تکمیل ہوسکتا ہے جو بائبل میں شروع ہوا جیسا کہ زبور اور عہدِ عتیق کے دیگر مصحفِ انبیاء سے تورات کی تعلیمات پر اضافہ ہوتا ہے اور جس طرح سے اناجیل وعہد جدید کے دیگر حصوں سے بنی آدم کو ایسی تعلیمات دی جاتی ہیں جوا گرچہ عہد عتیق کی تعلیمات سے پوری موافقت رکھتی ہیں تو بھی ان سے بہت اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ دین اسلام اور دین عیسوی کی بڑی بڑی تعلیمات کے امتحان سے ہم یہ دریافت اور فیصلہ کرسکینگے کہ بائبل وقرآن کا یہی حال ہے یا نہیں۔

اگر ہم کو یہ معلوم ہو کہ قرآن و بائبل کی تعلیمات میں موافقت ہے اور قرآن اخلاقی اور روحانی تعلیمات میں بائبل سے ایسا ہی بڑھ کر اور بہتر ہے جیسا کہ انجیل تورات سے تو ممکن ہے کہ مذکورہ بالا خیال درست ہو لیکن اگر بخلاف اس کے یہ ثابت ہو کہ چند خاص اور بڑی بڑی تعلیمات میں بائبل اور قرآن باہم متضاد اور متناقض ہیں تو صاف ظاہر ہوجائے گا کہ ان میں سے فقط ایک ہی سچا ہے اور حقیقی الہام یعنی کلام اللہ ہوسکتاہے۔ ہم بائبل وقرآن دونوں کو مذکورہ بالا محک امتحان کے وسیلہ سے پرکھینگے تاکہ خدا تعالیٰ کی رحمت وہدایت سے ہم دریافت کرسکیں اوریقینی طورپر ہم کو معلوم ہوجائے کہ دونوں میں سے کس کے وسیلہ سے فی الحقیقت راہِ نجات منکشف ہوتی ہے۔

جو کوئی حق جو ہے اور خدا کی مرضی کو بجالانا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ دلی سرگرمی وجوش اوراخلاص ارادت کے ساتھ خدای رحیم کے نام سے اس تحقیق کو شروع کرے اور اس ہمہ دان خالق ومالک سے یہ التجا والتماس کرتا رہا کہ وہ اپنی ہدایت کےوسیلہ سے اس کی نظر کو تمام تعصب وفرقہ بندی کی ظلمت سے پاک کردے تاکہ وہ الہیٰ ہدایت کی روشنی میں قدم نہ مارسکے۔

چنانچہ ہم خدایِ تعالیٰ کی رحمت وہدایت پر پورا بھروسہ کرکے بائبل اورقرآن کی تحقیق اوران کے امتحان کو شروع کرتےہیں تاکہ یہ معلوم کریں کہ آیا عقائدو فرائض کے اہم ترین امورمیں وہ باہم متفق ہیں یا نہیں اور اگروہ باہم مخالف ہیں تو دونوں میں سے کس میں الہام ایزدی مندرج ہے؟ یا ایسا اہم ترین امر ہے کہ جو شخص ابدی راحت ونیک بختی کا طالب ہو وہ اس کے بارے میں ہرگز ہرگز بے پرواہ ہونے کی جرات نہیں کرسکتا کیونکہ اظہر من الشمس ہے کہ اسی امر کی تحقیق کے نتیجہ پر ہماری ابدی سعادت ونجات یاہلاکت کا دارومدار ہے۔ اگر خدا تعالیٰ نے راہِ نجات کو ظاہر فرمادیا ہے اور ہم اسے دریافت کرکے اختیار نہیں کرتے توپھر ہم گمراہی اور روحانی ضلالت سے کیونکر بچ سکتےہیں؟

لیکن سب سے زیادہ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ تلاش وتحقیقِ حق میں ہر طرح کی مخالفت اور سخت کلامی سے برکناررہیں اور نفرت والزام دہی سے دست بردار ہوں کیونکہ اس سے بنی آدم کی روحانی آنکھوں کے سامنے پردہ حائل ہوجاتا ہے اور بیش بہا گوہر حق کی تلاش میں وہ ایک دوسرے کی مدد داعانت نہیں کرسکتے۔ دینی امور میں نہایت مناسب ہے کہ ایک دوسرے سے نفرت اورلڑائی جھگڑے کے عوض میں ہم ایک دوسرے کی قدر کریں اور خدایِ تعالیٰ کے حضور میں پہنچنے کے لئے اس زندگی کے پُرتکلیف سفر میں باہم معین نوپاورہوں کیونکہ ہم سب ایک ہی باپ آدم کے بیٹے ہیں اورہم سب کا خالق ایک ہی واحد وبرحق خدا ہے اوراس دنیا کے مکتب میں ہم سب اسی کے شاگرد ہیں۔ چنانچہ شیخ سعدی شیرازی نے خوب کہا ہے:

بنی آدم عضلہ ین یکدگیر اند — کہ درآفرینش زیک جوہر احمد

چو عضوئے بدرآورروزگار — دگر عضوہارا نماند قرار

اگر ہم اپنے ابنایِ جنس اور متلاشیانِ حق کی نورِ حق کی تلاش میں یادری اور مدد کرتے ہیں تو نہایت زیبا ہے کہ کامل توکل وامید کے ساتھ کمال عاجزی سے خدایِ رحیم ورحمان سے دعا کریں کہ وہ اپنے چہرے کے نور کر ہم پر جلوہ گرفرمائے اورہمیں یہ توفیق بخشے کہ ہم ہر طرح کی روحانی خودبینی کو اپنے آپ سے دور کریں کیونکہ خودبین ومتکبر انسان ہرگز ہرگز خدای تعالیٰ سے برکات کوحاصل نہیں کرسکتا۔ چنانچہ مشہور شاعر فیضی بے یوں کہاں ہے۔

افتاد گی آموز اگر تشنہ فیضی ہر گز نخورد آب زمینے کہ بلند است

پھر شاعر نے یہ بھی خوب کہاہے:

چون خدا خواہد کہ مان یاری کند ہبل مارا جانب راری کندر

جس طرح آفتاب جہا نتاب اپنے ہی نور کے وسیلہ سے ہمیں نظر آتاہے اسی طرح خدایِ تعالیٰ فقط اپنے ہی روحانی فیض کی تنویر کے ذریعہ سے اپنی نادیدہ ذات کو ہماری روحانی نظر میں جلوہ گرفرماتا ہے۔ پس جب ہم اپنی دلی دعاؤں کو خداوند کریم کے حضور میں پیش کرکے اس کے فضل وکرم کی ہدایت کو حاصل کریں اور عرفانِ حق تک ہماری رسائی ہو تو واجب ہے کہ ہم اس حق اور سچائی کو جہاں کہیں پاؤں فوراً قبول کریں کیونکہ تمام سچائی خدا کی طرف سے ہے جو کہ خود سچائی یعنی الحق کہلاتاہے ۔ جو کوئی سچائی یا حق تحقیر کرتا ہے وہ خود خدای تعالیٰ کورد کرتاہے۔

یہ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے پہلے حصے میں ہم جاہل وناواقف لوگوں کے اس قول پر غور کرینگے کہ تورات وزبور اورانجیل جو زمانہ حال میں مسیحیوں میں رائج ہیں محرف ومنسوخ شدہ ہیں۔ دوسرے حصے میں ہم مسیحی دین کی بڑی بڑی تعلیمات کا مختصر ذکر کرینگے اور اس کی تحقیق کرینگے کہ عہدِ عتیق وجدید مذکورہ بالامحک امتحان اور معیاروں کے سے درست وصحیح ٹھہرتے ہیں یا نہیں۔ تیسرے حصے میں ہم اس امر کی تحقیق کرینگے کہ آیا اہل اسلام کے بیان کے موافق قرآن کلام اللہ اور حضرت محمد خاتم النبین اوررسول اللہ ہیں یا نہیں ۔

راہِ نجات کی طرف رہنمائی کی اس کوشش پر خدا برکت بخشے اوران سب پر جواس راہ پرچلنے کے لئے خدا کے فضل کے آرزومند ہیں بار انِ رحمت کو کثرت سے نازل فرمادے۔

پہلا حصہ

اس بات کے ثبوت میں کہ انجیل اور عہدِ عتیق کی کتابیں کلام اللہ ہیں اور محرف ومنسوخ نہیں ہیں

پہلا باب

بائبل کے حق میں قرآن کی شہادت

علماء شہادت کوشہادتِ نقلی میں منقسم کیا ہے۔ شہادت عقلی میں اندرونی وبیرونی ہر دوطرح کی شہادت شامل ہے۔

اگر ہم یہ کتاب ملحدوں اور بُت پرستوں کے لئے لکھتے تو ضروری ہوتا کہ پہلے ہم بیرونی شہادت سے ثابت کرتے کہ انجیل شریف اور عہدِ عتیق کے تمام مقدس نوشتے قدیم وغیر محرف اور قابل اعتماد ہیں اوران میں خدای بزرگ وبرتر کا الہام مندرج ہے۔ علاوہ برین ان میں سے ہر ایک کتاب کی تواریخ بتانا بھی ضروری ہوتا اور یہ بھی بیان کرنا پڑتا کہ مقدس نوشتوں اور صحیفوں کی تکمیل کیونکر ہوئی اور جن مصنفوں سے یہ مختلف نوشتے منسوب ہیں ان سے منسوب کرنے کی صحت ودرستی پر کون سی بیرونی شہادت بہم پہنچی ہے۔ پھر ہم کو اس اندرونی شہادت کو بغور پرکھنا ہوتا جو کہ ان نوشتوں ہی سے ملتی ہے اور پھر اس تحقیق کے نتائج بیان کرنا ہوتا۔

مسیحی علماء بار بار یہ سب کچھ کرچکے ہیں۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ ابتدا ہی نے منکرین ہمارے پاک نوشتوں پر حملے کرتے چلے آئے ہیں اور علاوہ برین اپنے ذاتی اطمینان کے لئے ہم نے ان نوشتوں کی موافق ومخالف ہر طرح کی شہادتوں پر غور کیا ہے۔ اس سے بڑھ کر ہم مسیحیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ اس طرح سے پرکھنا اورامتحان کرنا ہمارا فرض ہے کیونکہ کلام اللہ میں مرقوم ہے کہ ساری باتوں کو آزماؤ" (۱ تھسلنیکیوں ۵: ۲۱) کیونکہ اس نے اسی غرض ومقصد سے ہم کو عقل عنایت کی ہے کہ اس کے جلال کے لئے ہم اس کا درست استعمال کریں۔ حق یا سچائی اللہ جل شانہ کی صفات میں سے ایک ہے لہذا اس کو کبھی زوال نہیں بلکہ موصوف حقیقی کی طرح ازلی وابدی ہے۔ پس جس کی دلی آرزو یہ ہے کہ حق کو دریافت کرے اور خدا تعالیٰ کی پاک واقدس مرضی کے مطابق زندگی بسر کرے اسے اپنے ایمان واعتقاد کے بنیادی اصول کے کامل امتحان سے ہر گز ہر گز خائف نہیں ہونا چاہیے کیونکہ جب وہ امتحان کرچکیگا تو نہ فقط خود حق وراستی کی محکم چٹان پر کھڑا ہوگا بلکہ اور ایسے اشخاص کی مدد کریگا جو شکوک کے سمندر میں بہے جاتے ہیں۔ اب اس کا ایمان کہلانے کے لائق ہے اور محق تقلید وتعصب یا نادانی کے نام سے نامزد نہیں ہوسکتا۔

مسیحی علماء کے کتب خانے مسیحی شہادات کی کتابوں سے بھرے پڑے ہیں لیکن اس موقع پر ان کا بیان کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم منکرین کے لئے نہیں بلکہ برادرانِ اہل اسلام کے لئے لکھ رہے ہیں جو کہ قرآن کو انسان کے لئے خدا کی طرف سے آخری الہام یا وحی مانتے ہیں اور جو کچھ اس میں مندرج ہے ان کے نزدیک وہ سب کا سب کلام اللہ ہے۔ اہل اسلام کو یہ دریافت کرنا اور جاننا ازحد ضروری ہے کہ بائبل کے بارے میں قرآن کیا کہتا ہے ۔ اس کی ایک بڑی بھاری توجہ یہ ہے کہ جہلامیں اس امر کے متعلق ایک بالکل غلط خیال اور بے بنیاد اعتقاد رائج ہے۔ اس مقام پر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس اہم معاملہ کے بارے میں بہت سے مسلمانوں کا خیال واعتقاد ان کی اپنی ہی دینی کتاب یعنی قرآن کی تعلیم کے بالکل خلاف ہے۔ اس لئے ہر ایک سچا مسلمان اس امر کی تحقیق میں کہ" بائبل کے بارے میں قرآن کیا شہادت دیتاہے اور موخرالذکر سے ہم مقدم الذکر کی نسبت کیا تعلیم حاصل کرسکتےہیں؟" ہمارے ساتھ شریک ہونے سے فائدہ اٹھاسکتاہے۔

یہ امر توسب پر عیاں ہے کہ خود قرآن اس بات پر شہادت دیتاہے کہ حضرت محمد کے زمانہ میں یہود ونصاریٰ ملکِ عرب میں موجود اور دینی امور میں باہم مخالف تھے۔ چنانچہ سورہ بقرہ کے چودھویں رکوع کی پہلی آیت میں یوں مرقوم ہے وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَى عَلَىَ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَى شَيْءٍ یعنی اور یہود نے کہا نہیں نصاریٰ کچھ راہ پر اور نصاریٰ نے کہا نہیں یہود کچھ راہ پر۔ یہ ہر دوفریق قرآن میں اہل کتاب کہلاتے ہیں ۔ پھر قرآن شاہد ہے کہ جس کتاب سے ان لوگوں نے اپنے القاب حاصل کئے فی الحقیقت ان کے پاس موجود تھی اوراس کتاب کے حصوں کو قرآن نہایت صفائی سے تورات وزبور اور انجیل کے نام سے بیان کرتاہے۔ علاوہ برین قرآن یہ بھی بیان کرتاہے کہ یہ کتابیں خدای تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئیں اور قرآن خود بعد میں ان کی تائید وتصدیق کی غرض سے دیا گیا۔ چنانچہ سورہ فاطر کے چوتھے رکوع میں یوں مندرج ہے وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِیعنی اورجو ہم نے تجھ پر اتاری کتاب وہی ٹھیک ہے سچا کرتی ہے آپ سے اگلی کو۔ پھر قرآن یہ بھی سکھاتاہے کہ جو لوگ ان کتابوں کو رد کرتےہیں ان کو عالم آخرت میں سزا ملیگی جیسا کہ سورہ مومن کی آٹھویں رکوع کی دوسری اور تیسری آیت میں مرقوم ہے الَّذِينَ كَذَّبُوا بِالْكِتَابِ وَبِمَا أَرْسَلْنَا بِهِ رُسُلَنَا فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ إِذِ الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلَاسِلُ يُسْحَبُونَ فِي الْحَمِيمِ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُونَ یعنی جنہوں نے جھٹلائی یہ کتاب اورجو بھیجا ہم نے اپنے رسولوں کے ساتھ سوآخر جان لینگے جب طوق پڑینگے ان کی گردنوں میں اور زنجیریں۔ گھسیٹے جائینگے جلتے پانی میں۔ پھر آگ میں ان کو جھونک دینگے۔ علاوہ برین قرآن اس امر کا بھی مظہر ہے کہ عہدِ عتیق اور عہدِ جدید کی کتابوں میں عام تعلیمات باہم موافق ومطابق ہیں۔ چنانچہ سورہ مائدہ کے ساتویں رکوع میں مرقوم

ہے۔وَقَفَّيْنَا عَلَى آثَارِهِم بِعَيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَآتَيْنَاهُ الإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ یعنی اور پچھاڑی بھیجا ہم نے انہیں کے قدموں پر عیسیٰ مریمہ کے بیٹے کو سچ بتاتا تورات کو جوآگے سے تھی اوراس کو دی ہم نے انجیل جس میں ہدایت اور روشنی اور سچا کرتی اپنی اگلی تورات کو اور راہ بتاتی اور نصیحت ڈروالوں کو۔ چونکہ بائبل کے حق میں قرآن یہ سب کچھ کہتا ہے اس لئے ہمیں بائبل کی تصدیق کے وہ سب ثبوت بہم پہنچانے کی ضرورت نہیں جو منکرین کوقائل کرنے کی غرض سے لکھتے وقت ضروری ہوتے ۔

لیکن شاید کوئی یوں کہے (۱) آپ مسیحی لوگ جو کہ قرآن کو من جانب اللہ نہیں مانتے معقول طور پر اپنی دلائل اور اپنے دعاوی کے ثبوت میں آیات قرآنی پیش نہیں کرسکتے(۲) علاوہ بریں جو کتابیں اب مسیحیوں میں عہد عتیق اور عہد جدید کے ناموں سے رائج ہیں وہ وہی کتابیں نہیں جن کا قرآن ذکر کرتاہے یاکم ازکم بہر حال وہ محرف ومنسوخ ہیں۔

اس کے جواب میں ہم یہ مان لیتے ہیں کہ اگر مسیحی لوگ پاک نوشتوں کی صحت اور ودرستی کے ثبوت کے لئے قرآن پر بھروسہ کریں تو پہلا اعتراض بالکل بجا اور معقول ہے کیونکہ ہم تو کسی صورت میں بھی قرآن کے محتاج نہیں کہ وہ ہماری کتب مقدسہ کی صحت وصداقت کو ہم پر یہ ثابت کرے۔آیاتِ قرآنی کو پیش کرنے سے ہمارا مقصد اور ہی ہے۔ ہم تواہل اسلام کو یہ دکھانے اور سمجھانے کی کوشش کررہے ہیں کہ قرآن کی اس تعلیم کو قبول کریں جو وہ یہود ونصاریٰ کی کتبِ مقدسہ کے بارے میں دیتاہے۔ اگرمذکورہ بالااعتراضوں میں سے دوسرا اعتراض بجا درست نہ ہو تو یہ دلیل بالکل معقول ہے ۔ یہ دوسرا اعتراض اگرچہ صاف طورسے قرآن کی تعلیم کے بھی خلاف نظر آتا ہے (کیونکہ سورہ انعام کے چوتھے رکوع کی چوتھی آیت میں مرقوم ہے۔وَلاَ مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ یعنی کوئی بھی اللہ کے کلام کو بدل نہیں سکتا) تو بھی انشاء اللہ ہم خدا کے فصل سے اس کتاب کے دیگر ابواب میں اس اعتراض کی تحقیق کرینگے لیکن اس تحقیق سے پیشتر ہم نہایت ادب سے قرآن کے چند مشہور مقامات کو اہل اسلام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تاکہ صاف معلوم ہوجائے کہ قرآن بائبل کے حق میں کیا شہادت دیتاہے ۔ ہم بڑے بڑے مشہور مفسرین اسلام کا بھی حوالہ دینگے تاکہ یہ بات صاف ثابت ہوجائے کہ ہم قرآن کی پیش کردہ عبارات کا ٹھیک مطلب سمجھتے ہیں۔

یہ بات خود قرآن ہی سے صاف ظاہرہے کہ الکتاب یعنی بائبل حضرت محمد کے زمانہ میں اھلِ کتاب کے پاس موجود تھی اور فقط اسم بے مسمی یا محض نام ہی نام نہ تھا۔ اس کے ثبوت میں قرآن کے بہت سے مقامات پیش کئے جاسکتے ہیں ۔ لیکن ہم فقط چندہی مقامات کو نقل کرنے پر اکتفا کرینگے۔

مثلاً سورہ مائدہ کے دسویں رکوع کی دوسری آیت میں یوں مرقوم ہے قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَى شَيْءٍ حَتَّىَ تُقِيمُواْ التَّوْرَاةَ وَالإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ یعنی حضرت محمد کو خدا کی طرف سے یہ حکم ملا کہ اہل کتاب سےکہدے اے کتاب والو تم کچھ راہ پر نہیں جب تک تورات وانجیل کو قائم نہ کرو اور اس چیز کو جو اتاری گئی تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے ۔ اس آیت کے شان نزول کے بارے میں ابن اہشام نے ابن اسحاق مورخ سے سیرۃ الرسول میں یوں روایت کی ہے کہ رافع بن حارثہ اور سلام ابن مشکم اورمالک بن الضیف اور رافع ابن ہرملہ آنحضرت کے پاس آئے اورکہا کہ " اے محمد کیا تونہیں کہتا کہ تو ابراہیم کے عقیدے اوراس کے دین پر قائم ہے اور کیا تواس تورات پرایمان نہیں رکھتا جو ہمارے پاس ہے اوراس کو من جانب اللہ اورحق نہیں مانتا؟آنحضرت نےکہا "ہاں لیکن تم نے نئی راہ نکالی ہے اور تم تورات کے اس مندرجہ عہد سے جو تمہارے ساتھ باندھا گیا تھا انکار کرتے ہواور جوکچھ لوگوں کو بتانے کا حکم ملا تھا اسے تم چھپاتے ہو۔ اس پر انہوں نے کہا" یقیناً ہم اسی کو مانینگے جو ہمارے پاس ہے اور فی الحقیقت ہم راستی پر قائم ہیں اور تجھ پر نہ ہم ایمان لاتے ہیں اور نہ ہی تیری پیروی کرینگے"۔ اس پر اللہ جل شانہ نے یہ آیت ان کے حق میں نازل فرمائی ۔ اس سے ہم صاف دیکھتے ہیں کہ حضرت محمد نے یہودیوں کی مروجہ کتب مقدسہ کو تسلیم وقبول کیا اگرچہ آپ نےان کی اختراع اور بدعتوں کی تردید کی جن کو انہوں نے سیدنا مسیح کے قول سے اتفاق کیا جو انہوں نے یہودیوں سے فرمایا جیساکہ انجیل شریف میں مندرج ہے (دیکھو متی ۲۳: ۱۶ تا ۲۴) قرآن کی مندرجہ بالا آیت اور ابنِ اسحاق کے بیان سے صاف عیاں ہے کہ حضرت محمد نے زمانہ میں یہود کے پاس تورات اور نصاریٰ کے پاس انجیل موجود تھی کیونکہ اگروہ کتابیں محرف ومنسوخ یا نابود ہوچکی ہوتیں توان کے مندرجہ اصولِ دین واحکام کی پابندی کا فرمان بالکل بے معنی ٹھہرتا اسلئے کہ نابود ہونے کی حالت میں اس پر عمل کرنا ناممکن ہوتا اور محرف ومنسوخ ہونے کی حالت میں ان کی پیروی کا نتیجہ راہِ حق سے برگشتگی اورگمراہی ٹھہرتا۔

پھر سورہ بقرہ کے چودھویں رکوع کی پہلی آیت مندرج ہے وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَى عَلَىَ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَى شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ یعنی یہود نے کہا نہیں نصاریٰ کچھ راہ پر اور نصاریٰ نے کہا نہیں یہود کچھ راہ پر اور وہ سب پڑھتے ہیں کتاب۔ فعل يَتْلُونَ صیغہِ حال میں ہے جس کے معنی میں وہ پڑھ رہے ہیں"۔ اس سے اظہر من الشمس ہے کہ اس وقت یہود ونصاریٰ کی کتب مقدسہ ان کے پاس موجود تھیں۔ اگر موجود نہ ہوتیں تو فعل بصیغہ ماضی ہونا چاہیے تھا نہ بصیغہ حال کیونکہ کتابوں کی عدم موجودگی میں کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ان پڑھ سکتے تھے اور فی الحقیقت پڑھا کرتے تھے؟

سورہ یونس کے دسویں رکوع کی دوسری آیت میں مرقوم ہے كُنتَ فِي شَكٍّ مِّمَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ فَاسْأَلِ الَّذِينَ يَقْرَؤُونَ الْكِتَابَ مِن قَبْلِكَ یعنی اگر تو شک میں ہے اس چیز کے بارے میں جو اتاری ہم نے تیری طرف تو پوچھ ان سے جو پڑھتے ہیں کتاب تجھ سے آگے کو۔ الرازی کچھ اختلاف ارا کا ذکر کرتاہے کہ آیا اس آیت میں رویِ سخن حضرت محمد کی طرف ہے یا نہیں۔ لیکن وہ بیان کرتاہے کہ جن کے نزدیک رویِ سخن آنحضرت کی طرف نہیں ہے وہ بھی اس آیت کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں کہ اس آیت میں خدای تعالیٰ اس ہر ایک فرد بشر سے مخاطب ہوتا ہے جو حضرت محمد کے کلام وبیان پرشک لاتا ہو اور یوں فرماتاہے " اے انسان جو ہدایت ہم نے محمد کی زبانی تیری طرف بھیجی ہے اگر تو اس پر شک لاتا ہے تو اہلِ کتاب سے پوچھ لے تاکہ وہ اس کی رسالت ونبوت کی صداقت کو تجھ پر ثابت کردیویں"۔ اس سے الرازی کو یہ سوال پیش آتا ہے کہ اگر یہود ونصاریٰ کی کُتب مقُدسہ کی فی الحقیقت تحریف اور تخریف وتنسیخ ہوچکی تھی توپھر خدا تعالیٰ نے لوگوں کو ان کتابوں کا حوالہ کیوں دیا؟ اس کا جواب کچھ تسلی بخش نہیں ہے کیونکہ وہ فقط یوں کہتا ہے کہ اگران کتابوں کے کچھ حصے ہنوز باقی تھے اور حضرت محمد کی رسالت پر شہادت دیتے تھے اور ان کی شہادت اور بھی صراحت رکھتی تھی۔

الرازی کا اپنا شخصی وذاتی خیال یہ ہے کہ خود حضرت محمد ہی کے لئے حکم ایزدی ہے[1] تاکہ اگر ان کے دل میں اپنی رسالت کے بارے میں شک پیدا ہو تو رفع ہوجائے۔ لیکن بہر حال اس آیت سے بات صاف ثابت ہوتی ہے کہ آنحضرت کے زمانہ میں اور آنحضرت سے پیشتر بھی یہود ونصاریٰ اپنی کُتب مقُدسہ کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ بیضاوی کا خیال بھی بالکل یہی تھا کیونکہ وہ اس آیت کے آخری حصہ کا بیان یوں کرتاہے "کیونکہ وہ اس پر پختہ ایمان رکھتے ہیں اور ان کی کتابوں میں ایسا ہی قرار دیا گیاہے جیسا کہ ہم نے تجھ کو سکھایا ہے" بیضاوی یہ بھی کہتا ہے کہ اس کامطلب ومقصد حضرت محمد کے وحی کو قائم کرتا اور کُتب مقدسہ سے شہادت پیش کرنا ہے اور نیز یہ کہ قرآن ان کتابوں کی تعلیمات کی تائید وتصدیق کرتاہے۔ جلالین نے اس کا مطلب یوں بیان کیا ہے" اے[2] محمد اگر تو شک میں ہے اس چیز کے بارے میں جو اتاری ہم نے تیری طرف مثلاً قصص کے بارے میں تو پوچھ لے ان سے جو تجھ سے پہلے سے توریت پڑھتے ہیں کیونکہ ان کے درمیان یہ باتیں قائم ہوچکیں ہیں اور وہ یقیناً تجھ کو سچائی اور حقیقت سے آگاہ کرینگے۔"

پھر سورہ اعراف کے اکیسویں رکوع میں یہودیوں کے حق میں یوں مرقوم ہے وَرِثُواْ الْكِتَابَ يَأْخُذُونَ عَرَضَ هَـذَا الأَدْنَى وَيَقُولُونَ

---

[1] الرازی جلد پنجم صفحہ ۲۸، ۲۹

[2] جلالین حصہ اول صفحہ ۲۰۵

سَيُغْفَرُ لَنَا وَإِن يَأْتِهِمْ عَرَضٌ مُّثْلُهُ يَأْخُذُوهُ أَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِم مِّيثَاقُ الْكِتَابِ أَن لاَّ يِقُولُواْ عَلَى اللّهِ إِلاَّ الْحَقَّ وَدَرَسُواْ مَا فِيهِ یعنی وارث ہوئے کتاب کے ---- کیا ان پر عہد نہیں لیا کتاب کے حق میں کہ نہ بولیں اللہ پر سچ کے سوا اور پڑھا انہوں نے جو لکھا ہے اس میں بیضاوین نے اس آیت کی تفسیر میں یوں لکھاہے انہوں [1] نے کتاب یعنی تورات اپنے باپ دادا سے ورثہ میں پائی۔ وہ اسے پڑھتےہیں اور اس کی مندرجہ تعلیمات سے واقف ہیں۔

سورہ آل عمران کے تیسرے رکوع کی تیسری آیت میں مرقوم ہے أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوْتُواْ نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَى كِتَابِ اللّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّى فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُم مُّعْرِضُونَ یعنی کیا تونے نہ دیکھے وہ لوگ جن کو ملاہے ایک حصہ کتاب کا۔ ان کو بلاتے ہیں اللہ کی کتاب کی طرف تاکہ ان میں حکم کرے۔ پھر ہٹ رہے ہیں ان میں سے بعضے تغافل کرکے۔ بیضاوی [2] کہتاہے نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ یعنی ایک حصہ کتاب سے یا تو تورات مرادہے یا کُتبِ آسمانی بالعموم ۔ اسکے بیان کے موافق بلانے والے حضرت محمد تھے اوراللہ کی کتاب سے یا توقرآن مرادہے یا تورات کیونکہ لکھاہے کہ "وہ (حضرت محمد) ان کے مدرسہ میں داخل ہوا اور نعیم ابن عمر اورحارث ابن زید نے اس سے کہا کہ تیرا دین کیا ہے؟ اس نے کہا دینِ ابراہیم۔ اس پر ان دونوں نے اس سے کہا ابراہیم تو یقیناً یہودی تھا۔ اس نے کہا آؤ تورات کو دیکھیں تاکہ وہ ہمارے درمیان فیصلہ کرے۔اس پر ان دونوں نے نارضامندی ظاہر کی اور اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی" اس بیان سے بھی صاف ظاہر ہے کہ حضرت محمد کے زمانہ میں یہودیوں کے پاس تورات تھی اور حضرت محمد نے اس کو بڑے وثوق کے ساتھ ثالث کیا تاکہ جو کچھ یہودیوں اورآپ کے درمیان امر متنازع فیہ تھا اس کا فیصلہ کرے۔ اس امر متنازع فیہ کے بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔

سورہ آل عمران کے دسویں رکوع کی دوسری آیت میں مرقوم ہے كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِـلاًّ لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلاَّ مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَى نَفْسِهِ مِن قَبْلِ أَن تُنَزَّلَ التَّوْرَاةُ قُلْ فَأْتُواْ بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ یعنی سب کھانے کی چیزیں حلال تھیں بنی اسرائیل کومگر جو حرام کرلی تھی اسرائیل نے اپنی جان پر تورات نازل ہونے سے پہلے ۔ توکہہ لاؤ تورات اور پڑھو اس کو اگرسچے ہو۔ آخری فقرے کی تفسیر میں بیضاوی کہتاہے کہ " ان کو حکم ملتاہے کہ اپنی کتاب کی تعلیم کے وسیلہ سے اپنی صداقت کو قائم کریں اورجو کچھ ان کی کتاب میں مندرج تھا اس سے ان کے لئے سرزنش تھی کیونکہ فی الحقیقت جو کچھ پہلے حرام نہ تھا ان کی غلط کاری کے سبب سے

---

[1] جلد اول صفحہ ۳۵۰

[2] جلد اول صفحہ ۱۵۱، ۱۵۲

حرام کردیا گیا۔ لکھاہے کہ جب حضرت محمد نے ان سے یہ کہا تو وہ حیران ہوگئے اور توراۃ کو پیش کرنے کی جرات نہ کرسکے" بیضاوی کے اس بیان سے اور کل آیت سے بالکل صاف ظاہر ہے کہ اس وقت یہودیوں کے پاس توراۃ موجود تھی۔[1]

سورہ مائدہ کے چھٹے رکوع کی آخری آیت میں مندرج ہے وَكَيْفَ يُحَكِّمُونَكَ وَعِندَهُمُ التَّوْرَاةُ فِيهَا حُكْمُ اللّهِ یعنی کس طرح تجھ کو منصف کرینگے حالانکہ ان کے پاس توراۃ ہے جس میں حکم ہے اللہ کا ؟ اس پر بیضاوی نے لکھاہے " یہ تعجب[2] کے الفاظ ہیں کہ جس پر وہ ایمان نہیں رکھتے اسے اپنا منصف کیونکر بناسکتے ہیں جبکہ انصاف اس کتاب میں مندرج ہے جو ان کے پاس موجود ہے۔"

اب توقران سے اسی قدر آیات کے اقتباس پر قناعت کرتے ہیں اور سے وہ بات صاف ثابت ہوتی ہے جس کی صداقت سے اصحابِ علم خوب واقف ہیں یعنی یہ کہ حضرت محمد کے زمانہ میں اہلِ کتاب کے پاس بائبل موجود تھی۔ اگرچہ یہی ثبوت کافی ہے لیکن ہمارے پاس اور ثبوت بھی ہیں جن میں سے ایک ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

---

[1] جلد اول صفحہ ۱٦٦

[2] جلد اول صفحہ ۲۵۹

قرآن میں بعض ایسی عبارات مندرج ہیں جوفی الحقیقت عہدِ عتیق اور عہدِ جدید سے اقتباس کی گئی ہیں یعنی بعض آیات بائبل سے قرآن میں درج کی گئی ہیں اور قرآن خود کہتاہے کہ یہ آیات بائبل میں موجود ہیں۔

مثلاً سورہ مائدہ کے ساتویں رکوع کی دوسری آیت میں مرقوم ہے وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالأَنفَ بِالأَنفِ وَالأُذُنَ بِالأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ یعنی لکھا ہم نے ان پر قصاص اس کتاب میں کہ جان کے بدلے جان اورآنکھ کے بدلے آنکھ اورناک کے بدلے ناک اورکان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت یہ آیت توراۃ کی کتاب خروج کے اکیسویں باب کی ۲۳ تا ۲۵ آیات سے لی گئی ہے۔

پھر سورہ انبیاء کے ساتویں رکوع میں مرقوم ہے وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ یعنی ہم نے لکھ دیا ہے زبور میں نصیحت کے بعد۔ آخر زمین پر وارث ہونگے میرے نیک بندے۔ یہ آیت ۳۷ ویں زبور کے ۲۹ ویں آیت کا اقتباس ہے ۔ بیضاوی کہتاہے کہ زبور[3] حضرت داؤد کی کتاب ہے۔

علاوہ بریں سورہ اعراف کے پانچویں رکوع کی پہلی آیت میں مندرج ہے إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُواْ بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُواْ عَنْهَا لاَ تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ

---

[3] جلد اول صفحہ ٦۲۵

السَّمَاء وَلاَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّى يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ یعنی بیشک جنہوں نے جھٹلائیں ہماری آیتیں اوران کے سامنے تکبر کیا نہ کھلینگے ان کے لئے دروازے آسمان کے اور نہ داخل ہونگے وہ جنت میں جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نہ گذرے ۔ یہ آیت انجیل سے اقتباس کی گئی ہے کیونکہ متی ۱۹ : ۲۴ اور مرقس ۱۰ : ۲۵ اور لوقا ۱۸ : ۲۵ میں اونٹ کے سوئی کے ناکے سے گذرنے کی مشکل کا ذکر پایا جاتا ہے۔

یہ تینوں آیات یعنی پہلی تورات کی دوسری زبور کی اور تیسری انجیل کی نہایت صفائی اورکمال صراحت سے ثابت کرتی ہیں کہ یہود ونصاریٰ کی کُتُب مقدسہ جو حضرت محمد کے زمانہ میں ان کے پاس موجود تھیں وہی اب ہمارے پاس ہیں اور ان کے نام بھی وہی ہیں جو اس وقت تھے۔ تمام اصحاب فہم اس امر کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اشعار ہم نے مثنوی مولوی جلال الدین رومی، دیوانِ علی ابنِ ابی طالب اور سعدی شیرازی سے نقل کئے ہیں ان کو پڑھ کر زمانہ آئندہ میں ہر ایک صاحب علم وفہم سمجھ سکیگا کہ یہ سب کتابیں اس صدی میں یعنی اس کتاب کی تصنیف کے وقت موجود تھیں۔ اسی طرح ہر ایک شخص جو قرآن کو غور سے پڑھتا ہے مندرجہ بالا اقتباساتِ بائبل کو پڑھ کر بآسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ حضرت محمد کے زمانہ میں بائبل موجود تھی۔ یہ ثبوت اس حقیقت سے اور بھی مضبوط ہوجاتاہے کہ مقتبساتِ مندرجہ بالا میں سے دو کے متعلق قرآن ان کتابوں کے نام بھی بتاتا ہے جن سے نقل کرتا ہے۔

علاوہ بریں بہت سے قصے جو قرآن میں مندرج ہیں مثلاً قصہ یوسف ،وغیرہ صاحب وہی ہیں جو کہ بائبل میں مرقوم ہیں اگرچہ بعض اوقات ان کا طرزبیان متن بائبل سے زیادہ یہودی روایات سے ملتا جلتا اور مطابقت رکھتاہے جیسا کہ کتاب مسمیٰ بہ تنویر الافہام مصادر السلام میں اورینابیع القرآن میں دکھایا گیاہے۔ قرآن میں اور بھی بہت سے حوالے بائبل کے متعلق پائے جاتے ہیں جن میں سے ہم فقط ایک ہی کو ذیل میں درج کرتے ہیں کیونکہ سب کے اندراج کی ضرورت نہیں ہے سورہ آل عمران کے دسویں رکوع کی دوسری آیت میں مرقوم ہے كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِـلاًّ لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلاَّ مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَى نَفْسِهِ یعنی سب کھانے کی چیزیں حلال تھیں اسرائیل کومگر جو حرام کرلی تھی اسرائیل نے اپنی جان پر۔ جب تک تورات کی کتاب پیدائش کے ۳۲ویں باب کی ۲۲آیت سے ۳۲آیت تک نہ پڑھیں اس آیت قرآنی کا مطلب سمجھنا بالکل ناممکن ہے کیونکہ ان آیات میں بتلایا گیاہے کہ کس طرح سے خدای تعالیٰ نے حضرت یعقوب کواسرائیل کا نام دیا اور پھر بعد میں بنی اسرائیل نے کس طرح سے ان نس کوجوران میں اندر کی طرف ہے کھانا حرام کردیا۔

ماسوامذکورہ بالاحوالوں کے احادیث میں بھی چند عبارات ایسی ہیں جن میں حضرت محمد نے عین بائبل کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ان عبارات میں ہم سے صرف ایک ہی جوکہ نہایت قابل غور ہے ذیل میں درج کرتے ہیں۔

مشکواۃ المصابیح مطبوعہ ۲۹۷ ہجری کے صفحہ ۴۸۷ پر بہشت اوراہل بہشت کے بیان میں بروایت ابوہریرہ یوں مرقوم ہے ۔ قال رسول اللہ ﷺ قال اللہ تعالیٰ اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علیٰ قلب بشر۔ یعنی فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ کچھ تیار کیا ہے جو نہ آنکھوں نے دیکھا اور نہ کانوں نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں کبھی اس کا خیال آیا۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ یہ پہلے کرنتھیوں کے دوسرے باب کی نویں آیت کی نقل کی ہے۔ یہ حدیث ازحد قابل غور ہے کیونکہ حضرت محمد نے کہا ہے کہ یہ خود اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے درحالیکہ نہ فقط جہلا بلکہ بہت سے مسلمان مصنفین اور علما بھی پولوس کی رسالت اوراس کے خطوط کے الہامی ہونے کے منکرہیں۔

بائبل عموماً دوحصوں میں تقسیم کی جاتی ہے۔اول عہدِ عتیق جس میں یہود کی کتب مقدسہ شامل ہیں۔ ان میں سے فقط چند باب ارامی زبان میں ہیں اور باقی سب اول سے آخر تک عبرانی میں ہے۔دوم عہد جدید جو کہ یونانی زبان میں ہے یہودی لوگ عہد جدید کو نہیں مانتے لیکن ہم مسیحی عتیق وجدید دونوں کومانتے ہیں۔ اسی واسطے بیضاوی سورہ عنکبوت کی چھیالیسیوں آیت کی تفسیر میں ہم کو أَهْلَ الْكِتَابِ لکھتا ہے قرآن میں بائبل عموماً الکتب کہلاتی ہے اگرچہ اس کے تین بڑے بڑے حصے جدا جدا ناموں یعنی تورات وزبور وانجیل سے بھی نامزد ہیں۔ یہودی لوگ عہدِ عتیق ہی کو تین حصوں میں یعنی تورات وصحف انبیاء وزبور میں تقسیم کرتے ہیں جیسا کہ انجیل لوقا کے ۲۴: ۴۴ آیت میں مندرج ہے ۔ اس تقسیم کا قریباً ایک سو تیس سال قبل از مسیح تک پتہ مل سکتا ہے۔ اس زمانہ میں یہودی لوگ تیسرے حصہ کو صحف کہتے ہیں لیکن چونکہ یہ صحف زبور سے شروع ہوتے ہیں اس لئے انجیل وقرآن دونوں میں زبور کے نام سے نامزد ہیں ۔پہلے حصہ کو قرآن التوراۃ کہتا ہے جو کہ عبرانی لفظ توارہ کی عربی صورت ہے۔ بعض اوقات تمام عہد عتیق کو اہل اسلام توراۃ کہتے ہیں اوراس کا سبب یہ ہے کہ تورات ہی سے عہد عتیق شروع ہوتا ہے۔ قرآن بعض اوقات انبیاء عہد عتیق کا بھی حوالہ دیتا ہے چنانچہ سورہ بقرہ کے سولھویں رکوع کی چھٹی آیت میں مرقوم ہے قُولُواْ آمَنَّا بِاللّهِ وَمَآ أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَقَ وَيَعْقُوبَ وَالأسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ یعنی تم کہو ہم نے یقین کیا اللہ پر اور جواتارا ہم پر اور جواتارا ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اوراس کی اولاد پر اور جوملا موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور جو ملا سب نبیوں کو اپنے رب سے۔ پھر یہی الفاظ آل عمران کے نویں رکوع کی چوتھی آیت میں مندرج ہیں۔ لہذا صاف ظاہر ہے کہ قرآن عہد عتیق کے تینوں حصوں کو الہامی اور من جانب اللہ ماننے میں انجیل کے ساتھ بالکل متفق ہے۔

مسیحی لوگ اکثر اوقات تمام عہد جدید کو انجیل کہتے ہیں اورقرآن بھی ایسا ہی کرتاہے۔اس کا ایک سبب یہ ہے کہ عہدِ جدید کے شروع میں اناجیل

اربعہ ہیں لیکن بڑا بھاری اور زیادہ معقول سبب لفظ انجیل یعنی بشارت ہے جس سے تمام کتاب کا مطلب ومقصد ظاہر ہوتا ہے۔ مرقس ۱۳: ۱۰ سے اور بہت سے اور مقامات سے اس امر کی توضیح ہوتی ہے۔

چونکہ یہ امر مسلمہ ہے کہ تمام عہد جدید حضرت محمد کے زمانہ میں مسیحیوں میں ہر جگہ بکثرت رائج تھا اور چونکہ نہ فقط قرآن ہی ایک عبارت کو جو تین انجیلوں میں پائی جاتی ہے نقل کرتا ہے (دیکھو متی ۱۹: ۲۴۔ مرقس: ۱۰: ۲۵۔ لوقا ۱۸: ۲۵) بلکہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں خود حضرت محمد نے بھی عہدِ جدید کے ایک اور مقام سے ایک آیت کا اقتباس کیا ہے لہذا تمام اصحاب فہم اور اربابِ عقل کے نزدیک اظہر من الشمس ہے کہ قرآن اس بائبل کا ذکر کرتا ہے جو حضرت محمد کے زمانہ میں یہود ونصاریٰ کے پاس موجود تھی اور اسے الہامِ الہیٰ تسلیم کرتا ہے۔ علاوہ بریں قرآن ہمیشہ نہایت تعظیم وتکریم کے ساتھ بائبل کا نام لیتا ہے اور اسے بڑے بڑے عظیم الشان القاب سے ملقب کرتا ہے۔ چنانچہ سورہ بقرہ کی سترویں آیت میں کلام اللہ، سورہ بقرہ کی پچاسویں اور سورہ انبیاء کی انچاسویں آیت فرقان اور سورہ بقرہ کی پچانویویں آیت میں نور وذکر اور کتاب اللہ کہتا ہے۔

مزید برین قرآن کہتا ہے کہ حضرت محمد کو وہی الہام دیا گیا ہے جو کہ انبیاء سلف کو دیا گیا تھا۔ چنانچہ مقاماتِ ذیل سے یہ امر مدقل دمبرہن ہے: (۱) سورہ آل عمران کے آٹھویں رکوع کی تیسری آیت میں مندرج ہے قُلْ إِنَّ الْهُدَى هُدَى اللّهِ أَن يُؤْتَى أَحَدٌ مِّثْلَ مَا أُوتِيتُمْ یعنی توکہہ ہدایت وہی ہے جو ہدایت اللہ کرے۔ یہ اس واسطے کہ اور کو ملا جیسا کچھ تم کو ملا تھا۔(۲) سورہ نساء کے تیئسیوں رکوع کی پہلی آیت میں مرقوم ہے إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَى نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِن بَعْدِهِ یعنی ہم نے وحی بھیجی تیری طرف جیسے وحی بھیجی نوح کو اور نبیوں کو اس کے بعد۔(۳) سورۃ الشوریٰ کی پہلی آیت میں مسطور ہے كَذَلِكَ يُوحِي إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكَ اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ یعنی اس طرح وحی بھیجتا ہے۔ تیری طرف اور تجھ سے پہلوں کی طرف اللہ زبردست ہے حکمت والا۔ جو لفظ انزل نزول قرآن کے بیان میں استعمال ہوا ہے وہی کتب قدیم کے حق میں استعمال کیا گیا ہے۔ لہذا چونکہ جو چیزیں ایک ہی چیز کے برابر ہوں وہ باہم برابر ہوتی ہیں ہم نہایت صفائی سے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ قرآن خود ہم کو تعلیم دیتا ہے کہ عہدِ عتیق اور عہدِ جدید فی الحقیقت ایسے ہی من جانب اللہ وحی الہیٰ ہیں جیسا ہونے کا قرآن خود دعویدار ہے۔ اسی واسطے قرآن اہل اسلام کو قدیمی کُتب مقدسہ پر ایسا ہی پختہ ایمان لانے کی تاکید کرتا ہے جیسا کہ اپنے آپ پر (دیکھو سورہ بقرہ آیت ۱۳۰۔ آل عمران آیت ۷۸) اہل اسلام کو یہ بھی بتلایا جاتا ہے کہ قرآن کے نزول کی یہ غرض تھی کہ یہود ونصاریٰ کی کُتبِ مقدسہ کی تصدیق کرتے۔ چنانچہ سورہ آل عمران کی دوسری آیت میں یوں مرقوم ہے نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنزَلَ التَّوْرَاةَ وَالإِنجِيلَ مِن قَبْلُ هُدًى

لِّلنَّاسِ وَأَنزَلَ الْفُرْقَانَ یعنی تحقیق اتاری تجھ پر کتاب ثابت کرتی اگلی کتاب کو اور اتاری تھی تورات اورانجیل اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کو اور اتاراانصاف ، علاوہ بریں یہ بھی لکھاہے کہ جولوگ اس کتاب کورد کرتے ہیں ان کو خدا سزا دیگا۔ چنانچہ سورہ مومن کے ساتویں رکوع میں مندرج ہے الَّذِينَ كَذَّبُوا بِالْكِتَابِ وَبِمَا أَرْسَلْنَا بِهِ رُسُلَنَا فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ذ الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلَاسِلُ يُسْحَبُونَ ي الْحَمِيمِ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُونَ یعنی جنہوں نے جھٹلائی یہ کتاب اورجو بھیجا ہم نے اپنے رسولوں کے ساتھ سوآخر جان لینگے۔ جب طوق پڑینگےان کی گردنوں میں اور زنجیریں ۔ گھسیٹے جائینگے جلتے پانی میں اور پھر آگ میں ان کو جھونکینگے[1] ۔ ان آیات کی تفسیر لکھتے وقت بیضاوی[2] الکتب کے مفہوم میں مختلف بیانات پیش کرتا ہے وہ کہتاہے کہ اس سے قرآن یا دیگر کتبِ سماوی مراد ہیں۔ وَبِمَا أَرْسَلْنَا بِهِ رُسُلَنَا سے وہ دیگر کتب یا الہام اور دینی شریعت وقوانین مراد لیتا ہے ۔ پس اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ الکتب سے وہی کتاب مراد نہیں ہے جس کے سبب سے یہود ونصاریٰ اہل کتاب کہلاتے ہیں تو بھی اس آیت کے باقی الفاظ سے نہایت صفائی وصراحت کے ساتھ عہد عتیق اور عہد جدید ہی مراد ہیں۔

---

[1] قرآن میں اس قسم کی اور بھی بہت سی آیات ہیں۔ مثلاً سورہ بقرہ آیت ۳۸، ۸۳- ۸۵، ۹۱، ۹۵، سورہ مائدہ آیت ۵۲- سورہ انعام آیت ۹۲ - سورہ فاطر آیت ۲۸ - سورہ احقاف آیت ۱۱ -

[2] جلد دوم صفحہ ۲۱۶

قرآن میں یہ بھی مندرج ہے کہ عہدِ عتیق اور عہد جدید عام تعلیم میں باہم موافق ومطابق ہیں کیونکہ اس مضمون کی بہت سی آیات قرآن میں موجود ہیں۔ چنانچہ سورہ مائدہ کے ساتویں رکوع کی تیسری آیت میں مرقوم ہے" اور پچھاڑی بھیجا ہم نے انہیں کے قدموں پر عیسیٰ مریم کے بیٹے کو۔ سچ بتاتا تورات کو جوآگے سے تھی اوراس کو ہم نے دی انجیل جس میں ہدایت اور روشنی ہے اور سچا کرتی اپنی اگلی تورات کواور رہ بتاتی اور نصیحت ڈروالوں کو"۔

اب جو کچھ اس باب میں کہا گیا ہے اس سے ہم ذیل کے نتیجے نکالتے ہیں۔

(اول) حضرت محمد کے زمانہ میں یہود نصاریٰ کی کُتُبِ مقدسہ یعنی تورات اور زبور اور صحف انبیاء وانجیل اور رسولوں کے خطوط اور چند اور رسالے یہود ونصاریٰ کے پاس موجود تھے(دوم) قرآن سے بالکل صاف ظاہر ہے کہ یہ سب کُتُب وصحف الہام الہیٰ کے وسیلہ سے دئے گئے تھے (سوم) قرآن جبکہ اپنے طرز بیان کو سب سے اعلیٰ درجے کا بتاتا ہے اوراعلیٰ الہام والقاب کا اپنے لئے دعویدار ہے تو ساتھ ہی بائبل کو بھی اسی رتبہ کا الہام قرار دیتا ہے۔(چہارم) قرآن بائبل کو کتاب اللہ وکلام اللہ وفرقان وذکر اور نور وھدایت اور رحم وغیرہ کے القاب سے ملقب کرتا ہے۔ یہ القاب بالکل وہی ہیں جن کا قرآن خود دعویدار ہے(پنجم) قرآن یہ تعلیم دیتاہے کہ حضرت محمد کو خدا کی طرف سے یہ حکم ملا تھا کہ بائبل کو ثالث ٹھہرائے اور یہود ونصاریٰ کو تاکید

کرے کہ وہ بائبل کو اپنی رہنما بنائیں۔ (ششم) حضرت محمد نے یہودیوں کے سامنے بائبل کو حکمِ عدل کے طور پر پیش کیا۔ (ہفتم) قرآن مسلمانوں کے لئے بائبل پر ایمان لانا ایسا ہی لازم وواجب قرار دیتا ہے جیسا کہ خود قرآن پر (۸) جو لوگ بائبل یا قرآن کو رد کرتے ہیں ان کے لئے روزِ حشر میں سخت عذاب کے وعید موجود ہیں۔

دوسرا باب

عہدِ عتیق وجدید ہر گز منسوخ نہیں ہوئے اور اپنے واقعات و تعلیمات واصول اخلاق میں کبھی منسوخ نہیں ہوسکتے

اس کتاب کے پہلے باب میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے صاف عیاں ہے کہ وہ تمام مسلمان جو فی الحقیقت قرآن پر ایمان لاتے اور اسے قبول کرتے ہیں ان کو واجب ولازم ہے کہ کتاب اللہ یعنی کُتب مقدسہ عہدِ عتیق وجدید کی تلاوت و تعظیم اور فرمانبرداری کریں۔

لیکن بعض کہتے ہیں کہ یہ نتیجہ درست نہیں ہے اور ان کے نزدیک اس کا سبب (۱) یہ ہے کہ عہد عتیق وجدید منسوخ ہوچکے ہیں۔ (۲) بعض کہتے ہیں کہ وہ کتابیں جو کہ بائبل کے نام سے اب رائج ہیں اور جن کو یہود و نصاریٰ اپنی کتب مقدسہ تسلیم کرتے ہیں وہی نہیں ہیں جن کا قرآن ذکر کرتا ہے۔ (۳) بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر یہود و نصاریٰ کی کتب مقدسہ فی الحقیقت وہی ہیں جن کا قرآن میں ذکر آیا ہے تو بھی کم از کم ان کی تحریف وتخریف ہوچکی ہے اور اب وہ تعظیم وتکریم کے لائق نہیں ہیں۔ ان تینوں اعتراضات میں سے

آخری دو کے بارہ میں تو انشا اللہ آئندہ ابواب میں لکھینگے ۔ اس باب میں ہم اس امر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ کیا یہ سچ ہے کہ عہدِ عتیق وجدید یعنی تورات وزبور اور انجیل منسوخ ہوچکی ہیں؟ اس میں شک نہیں کہ اگر یہ اعتراضات بجاو برحق ہیں تو جو استدلال ہم نے پہلے باب میں پیش کیا ہے وہ بالکل باطل ٹھہرتا ہے لیکن ساتھ ہی قرآن کی صحت وصداقت کے لئے بھی جیسا کہ ہر ایک صاحب فہم سمجھ سکتا ہے کہ اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔

پوشیدہ نہ رہے کہ بعض مصنفینِ اہل اسلام صاف کہتے ہیں کہ بائبل یعنی کتاب مقدس منسوخ ہوچکی ہے ۔ چنانچہ سورہ توبہ کی انیتسویں آیت کے مندرجہ فقرہ وَلاَ یَدِینُونَ دِینَ الْحَقِّ کی تفسیر میں بیضاوی[1] لکھتا ہے کہ اس سے سب ادیانِ سلف منسوخ ہوتے ہیں اور سب سے پہلے دین کے بارہ میں بیضاوی کا بیان یہ ہے کہ وہ ایمان واعمال کے لحاظ سے منسوخ ہوچکا ہے ۔ علاوہ برین عیون اخبار الرضا کے چھیتسویں باب میں یوں مرقوم ہے کل نبی کان فی ایام موسیٰ وبعدہ کان علیٰ منہاج موسیٰ وشریعتہ وتابعاً الکتابہ الیٰ زمن عیسیٰ وکل نبی کان فی ایامہ عیسیٰ وبعدہ کان علیٰ منہاج عیسیٰ وشریعتہ وتابعاً لکتابہ الی زمن نبینا محمد صلعم وشریعۃ محمد صلعم تنسخ الی یوم القیامۃ یعنی ہر ایک نبی جو حضرت موسیٰ کے زمانہ میں اور اس کے بعد تھا وہ حضرت موسیٰ کی راہ اور اس کی شریعت پر تھا اور حضرت عیسیٰ کے زمانہ تک اسی کی کتاب کا فرمانبردار تھا اور ہر ایک نبی جو حضرت عیسیٰ کے زمانہ میں اور اس کے بعد تھا وہ حضرت عیسیٰ کی راہ اور اس کی شریعت پر تھا اور حضرت محمد کے زمانہ تک اسی کی کتاب کا فرمانبردار تھا اور حضرت محمد کی شریعت روزِ قیامت تک منسوخ نہیں ہوگی۔ اس عبارت کا مطلب صاف یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ کی شریعت نے حضرت موسیٰ کی شریعت کو منسوخ کردیا اور حضرت محمد کی شریعت سے حضرت عیسیٰ کی شریعت منسوخ ہوگئی۔علاوہ برین اخوند ملا محمد تقی کاشانی اپنی فارسی تصنیف ہدایت الطالبین اور اصول الدین میں جو ۱۲۸۵ ہجری میں اختتام کو پہنچی صفحہ ۱۶۶ پر یوں کہتا ہے" علم از ہرای اہل اسلام بہم رسیدہ بہ اینکہ حالا محمد ﷺ پیغمبر است ودین اوناسخ دین پیغمبران گذشتہ است" ۔ تمام اسلامی ممالک میں تمام جہلا اور بہت سے علما کا یہی اعتقاد ہے۔

لیکن تمام قرآن میں اس اعتقاد کی تائید میں ایک لفظ بھی نہیں ملتا اور وہ تمام احادیث جو سنی اور شیعہ لوگوں میں رائج ہیں ان میں ایک جملہ بھی کہیں نہیں ملتا جو اس بے بنیاد اعتقاد کی تائید کرے بلکہ تمام قرآن کا رخ اس خیال واعتقاد کے بالکل برخلاف ہے ۔فعل نسخ منسوخ کرنے کے معنی میں قرآن میں فقط دو مقام پر یعنی سورہ بقرہ کی ۱۰۰ ویں آیت اور سورہ حج کی ۵۱ ویں آیت آیا ہے اور ان ہر دو مقام پر عہدِ عتیق یا عہدِ جدید کے لئے استعمال نہیں ہوا بلکہ بخلاف اس کے خود قرآن ہی کی بعض آیات کے منسوخ ہونے کو ظاہر کرتا ہے ۔

[1] جلد اول صفحہ ۳۸۳

چنانچہ علمایِ اسلام کہتے ہیں کہ قرآن کی ۲۲۵ آیتیں منسوخ ہو گئی ہیں۔ سورہ بقرہ کی ۱۰۰ ویں آیت میں یوں مرقوم ہے مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللّهَ عَلَىَ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ یعنی جو منسوخ کرتے ہیں ہم کوئی آیت یا بھلادیتے ہیں تو پہنچاتے ہیں اس سے بہتر یا اس کی مانند کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے ؟ بیشک بیضاوی [1] لکھتا ہے کہ اس آیت کی قرات کئی طرح پر ہے اورایک قرات کے مطابق اس کا ترجمہ یہ ہوگا" آیت کا جو حصہ ہم تجھ کو بھلادیتے ہیں یااسے منسوخ کردیتے ہیں" ۔لیکن کسی قرات کے لحاظ سے بھی مطلب تبدیل نہیں ہوتا۔

بہر حال فقط قرآن ہی کی بعض آیات کے منسوخ ہونے کا ذکر ہے سورہ حج کی ۵۱ ویں آیت کی تفسیر میں بیضاوی [2] کے بیان سے اس امر کی بخوبی تشریح ہوتی ہے۔ بیضاوی بتاتا ہے کہ سورہ نجم کی ۱۹ اور ۲۰ ویں آیت سے کس طرح خدا نے تلک الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترجی کے جملہ کو منسوخ کیا کیونکہ یہ الفاظ لات وعزیٰ اورمنات عربی بتوں کے حق میں شیطان نے حضرت محمد کے منہ سے نکلوائے تھے۔ سورہ حج کی ۵۱ ویں آیت کی تفسیر میں یحییٰ اور جلال الدین بھی یہی کہانی سناتے ہیں اورابن اسحاق بھی ابن ہشام کی سیرت الرسول

[1] جلد اول صفحہ ۸۷

[2] جلد اول صفحہ ۶۳۶ اور ۶۳۷

جلد اول کے صفحہ ۱۲۷ پر یونہی لکھتاہے۔ اور طبری وواہب اللدینہ بھی یہی قصہ بیان کرتے ہیں۔ پس مذکورہ بالاآیت میں فَیَنسَخ اللہ کا مفہوم ظاہر ہے۔

اگرچہ یہ وہم بالکل بے بنیاد ہے کہ زبور کے نزول سے تورات منسوخ ہوگوی اورپھر اسی طرح انجیل کے نزول نے زبور کومنسوخ کردیا اوراگرچہ قرآن واحادیث سے اس کی مطلق تائید نہیں ہوسکتی توبھی اس کثرت سے اہلِ اسلام اس کے معتقد ہیں اورعلانیہ اس کا اظہار ودعویٰ کرتے ہیں کہ اس کی تردید میں ایک معتبر کتاب کو پیش کرنا بیجا نہ ہوگا۔ چنانچہ شیخ حاجی رحمت اللہ دہلوی اپنی کتاب اظہار الحق مطبوعہ ۱۲۸۴ ہجری جلد اول کے صفحہ ۱۱ ، ۱۲ پر یوں تحریر فرماتے ہیں کہ فقولہ نسخ التوراۃ بنزول الزبور نسخ الزبور بظھور الانجیل بھتان اثرلہ فی القرآن ولافی التفاسیر یل لاثرلہ فی کتاب من الکتب المعتبرۃ لاھل الاسلام ، الزبور عندنالیس بناسخ اللتوارۃ ولا بمنسوخ من الانجیل وکان داؤد علیہ السلام علی الشریعۃ موسیٰ علیہ السلام وکان الزبور ادعیۃ یعنی یہ کہنا کہ تورات زبور کے نزول سےمنسوخ ہو گئی اور زبور انجیل کے ظہور سے سراسر بہتان ہے جس کا قرآن وتفاسیر میں نام ونشان تک نہیں ملتا بلکہ کُتُبِ اسلامیہ سے کسی معتبر کتاب میں اس کا سراغ نہیں اورہمارے نزدیک زبور تورات کومنسوخ نہیں کرتی اور نہ انجیل سے زبور منسوخ ہوتی ہے حضرت داؤد حضرت موسیٰ کی شریعت پرتھے اور زبور دعاؤں کا مجموعہ تھا یہ مصنف بیان کرتاہے کہ اہل اسلام میں سے فقط جہلا اور عوام ہی اس غلط خیال میں مبتلاہیں جس کی وہ بڑے زور سے تردید کرتاہے۔

بیشک اس طرح کا باطل خیال قائم ہو کر جاری رہ سکتا ہے اور اس کا پہلا سبب یہ ہے کہ اس خیال میں مبتلا ہونے والے قرآن سے واقف نہیں ہیں اور دوسرا یہ کہ ان کو عہد عتیق اور عہد جدید کا مطلق علم نہیں ہے کیونکہ اگر کوئی غور وفکر اور دعا کے ساتھ بائبل کو مطالعہ کرے اور اس کی تعلیمات کو سمجھے تو صاف دیکھ لیگا کہ عہدِ عتیق وعہد جدید کی تعلیمات باہم موافق ومطابق ہیں۔ اس سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ عہد عتیق وجدید کی تعلیمات دینی تربیت کے ایک خاص سلسلہ میں دی گئی ہیں اور ان کے وسیلہ سے خدای تعالیٰ کا ازلی ارادہ بنی آدم پر بتدریج ظاہر ومنکشف کیا گیا ہے۔

عہد عتیق سے ہم معلوم کرتے ہیں کہ خداوند کریم نے بنی آدم کو کس طرح پیدا کیا اور وہ کیونکر گناہ میں مبتلا ہوگئے اور پھر اسی زمانہ میں کس طرح عورت کی نسل سے ایک آدمی کے آنے کا الہیٰ وعدہ کیا گیا ۔ پھر بہت عرصہ بعد جب تمام اقوامِ عالم حق سے برگشتہ ہو گئی تھیں کس طور پر اللہ جل شانہ نے حضرت ابراہیم کو بلایا اور اس کے ساتھ عہد باندھا اور فرمایا کہ منجئیِ موعود اس کی نسل سے اسحاق کی اولاد میں سے ہوگا ۔ پھر ہم کو یہ بتلایا جاتا ہے کہ یہی وعدہ اسحاق اور اس کے بیٹے یعقوب سے کیا گیا ۔ پھر یہ کہ بنی اسرائیل مصر کنعان میں اس کام کے لئے تیار کئے گئے جس کے لئے خدا نے ان کو برگزیدہ کیا تھا ۔ پھر ہم کو یہ بھی بتلایا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ کو کس طرح تورات دی گئی اور اس میں یہ سب وعدے درج کئے گئے اور نئے وعدوں کا اضافہ کیا گیا۔ ہر پُشت میں نبی معبوث ہوئے تا کہ بنی اسرائیل کو گناہوں پر ملامت کریں اور خدا کی مرضی کو ان پر ظاہر کریں۔ یہ انبیا یکے بعد دیگرے وہ تعلیم دیتے رہے جو روحانیت میں بتدریج ترقی کرتی گئی ۔ انہوں نے نیکوکار اور وفادار ایمان داروں کو سکھلایا کہ خدای تعالیٰ عزوجل کا کامل عرفان حاصل کریں۔ بہت سے انبیا نے آنے والے نجات دہندہ کے کام کی لوگوں کے سامنے تشریح کی اور ان کو پیشتر ہی سے آگاہ کردیا کہ وہ کہاں پیدا ہوگا۔ کیا کام کریگا اور کیا کیا دکھ اٹھائیگا ۔ پھر عہدِ جدید میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ انبیا کی پیشینگوئیاں کس طرح پوری ہوئیں اور اس نجات دہندہ نے اپنے شاگردوں کو یہ حکم دیا کہ تمام حدود عالم تک انجیل کی منادی کریں اور سب لوگوں کو شاگرد بنائیں اور اس کی دوسری آمد کے منتظر رہیں جبکہ وہ آکر تمام زندوں اور مردوں کی عدالت کریگا اور جہان کو کمال بخش کر ابدالآباد تک سلطنت کرے گا۔ اعمال الرسل اور خطوط سے مفصل طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ انجیل کی منادی کا کام رسولوں اور دوسرے شاگردوں نے کس طرح شروع کیا۔ پھر آخر میں کتاب مکاشفات میں اس کشمکش کا نہایت پُرزور بیان مندرج ہے جو کہ مسیحی کلیسیا کو شیطان اور بدکردار بنی آدم سے کرنی پڑیگی اور نیز یہ کہ آخر کار خدا کی سلطنت غالب آئیگی۔ پس اگر عہدِ عتیق وجدید کو بحیثیت مجموعی دیکھیں تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے تعلیم وتربیت کا باقاعدہ اور سلسلہ وار انتظام اس کے پُرفضل ارادے کے متدارج اظہار اور نیکوں کی آخری فتحمندی کا مکاشفہ ہے۔ بائبل نہایت حیرت افزا

عمارت کی مانند ہے۔ تورات بمنزلہ بنیاد اور دیگر کُتب اس کاخِ پُرشان کی تکمیل ہیں۔ اس کامل عمارت پر نظر کرنے سے خدایِ رحیم ورحمان اور خالق کون ومکان کی دانائی اور عدل وانصاف اوربے پایانِ محبت کا پتہ ملتاہے۔ تورات میں انسان کے حق میں خدا کے پاک ارادے کا ایسے طور سے ذکر کیا گیا ہے جس سے یہ امر ممکن ٹھہرتاہے کہ انسان اللہ جل شانہ کا عرفان حاصل کرکے اس پر ایمان لائے اور پسندیدگی کے ساتھ اس کی عبادت وخدمت کرے اوراپنی روحانی آرزو کو پورا کرکے ابدی سعادت ونیک بختی حاصل کرے۔ صحف انبیاء وزبور میں یہ تعلیم بتدریج ترقی کرتی جاتی ہے۔ ان کتابوں میں حق سبحانہ وتعالیٰ ہم کو صاف دکھاتاہے کہ کس طرح شروع ہی سے وہ بنی اسرائیل کو ان کی خطاؤں اور تقصیروں کے باوجود دینی امور میں تمام جہان کے معلم بنانے کے لئے تیار کررہا تھا۔ اس طرح سے انبیاء کی معرفت اس وحدہ لاشریک نے صاف دکھلادیا کہ ظاہری رسوم جوکہ اکثر حالتوں میں غیر اقوام سے لی گئیں لیکن کچھ عرصہ تک بنی اسرائیل کے استعمال کے لئے کسی قدر تصحیح کے ساتھ تورات میں جائز قرار پائیں بذاتِ خود ان میں کوئی خوبی نہ تھی اور نہ ہی وہ مقصود تھیں اگرچہ وہ حصولِ مقصود میں کار آمد وسیلہ تھیں اوراس مقصود کے دو حصے تھے(۱) یہ تھا کہ بنی اسرائیل کا موعودہ نجات دہندہ کے آنے تک تمام دیگر اقوام سے جدا کرے اور (۲) ان کو یہ تعلیم دے کہ ظاہری رسوم خواہ وہ الہیٰ شریعت کی صورت میں بھی ہوں ان سے نہ انسان کی روح کی تسکین اور نہ خدا کی خوشنودی حاصل ہوسکتی تھی بلکہ وہ حقیقی عبادت کا سایہ تھیں کیونکہ خدا کے پسندیدہ عبادت کرنے والوں کو لازم ہے کہ روح وراستی سے اس کی عبادت کریں۔

چنانچہ سموئیل کہتاہے " کیا خداوند سوختنی قربانیوں اور ذبیحوں سے خوش ہوتاہے یا اس سے اس کہ اس کا حکم مانا جائے ؟ دیکھ حکم ماننا قربانی چڑھانے سے اور شنوا ہونا مینڈھوں کی چربی سے بہتر ہے "(۱۔سموئیل ۱۵: ۲۵)میکاہ نبی کی کتاب میں مرقوم ہے کہ " میں کیا لے کے خداوند کے حضور میں آؤں اورخدایِ تعالیٰ کے آگے کیونکر سجدہ کروں؟ کیا سوختنی قربانیوں اور یکسالہ بچھڑوں کو لے کراس کے آگے آؤں گا؟ کیا خداوند ہزاروں مینڈھوں سے یا تیل کی دس ہزار نہروں سے خوش ہوگا ؟ کیا میں اپنے پہلوٹھے کو اپنے گناہ کے عوض، اپنے پیٹ کے پھل کو اپنی جان کی خطا کے بدلے میں دے ڈالونگا؟ نبی نے جو اس کا جواب دیا اس سے صاف ظاہر ہے کہ دلی اور عملی زندگی کی زندہ خدا کے لئے تخصیص کئے بغیر قربانیاں اور تمام دیگر رسوم بے سود تھیں۔ چنانچہ یوں مسطور ہے " اے انسان اس نے تجھے وہ دکھایا ہے جو کچھ کہ بھلاہے اور خداوند تجھ سے اور کیا چاہتا ہے مگر یہ کہ تو انصاف کرے اور رحمدلی کو پیار کرے اوراپنے خدا کے ساتھ فروتنی سے چلے"(میکاہ ۶ : ۶تا ۸)۔انبیایِ عہدِ عتیق کی اس تعلیم سے سیدنا مسیح بالکل متفق ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ " وہ وقت آتاہے کہ اب ہی ہے کہ سچے پرستار باپ (پروردگار) کی پرستش روح

اور سچائی سے کرینگے کیونکہ باپ اپنے لئے ایسے ہی پرستار ڈھونڈتا ہے ۔ خدا روح ہے اور ضرور ہے کہ اس کے پرستار روح اور سچائی سے پرستش کریں"(یوحنا ۴: ۲۳تا ۲۴)۔

جب یہ اعلیٰ درجہ کی روحانی تعلیم دی گئی اور تمام جہان کے گناہوں کا کفارہ دیا گیا(۱ ۔یوحنا ۲:۲) تب چیدہ وبرگزیدہ گواہ یعنی مسیح کے حواری اور دیگر شاگرد بھیجے گئے تاکہ اس خوشخبری کو حدودعالم تک پہنچادیں اور تمام بنی آدم کو خدا کے اس مفت فضل کو قبول کرنے کی دعوت دیں جو کہ سیدنا مسیح کے وسیلہ سے حیات ابدی ہے(رومیوں ۶: ۲۳) تاکہ وہ گناہ کی موت سے آزاد ہوکر راستبازی کی زندگی اختیار کریں اور تمام رویِ زمین کو عرفان الہیٰ سے ایسا معمور کرنے کی کوشش کریں جیسے سمندر پانی سے معمور ہے(یسعیاہ ۱۱: ۱۹)۔

تورات کی مندرجہ عبادات جو کہ حیوانات کی قربانیوں اور خوشبو وغیرہ کی دیگر ظاہری رسوم کے وسیلہ سے کی جاتی تھیں ان کے بارے میں یہ تعلیم کوئی نئی بات نہ تھی کہ آئندہ زمانہ میں ان کی جگہ وہ روحانی عبادت قائم ہوگئی جس کی یہ محض ایمان ونشان تھیں۔ چنانچہ عہدِ عتیق میں یرمیاہ نبی کی کتاب کے اکتیسویں باب کی ۳۱سے ۳۳آیت تک یوں مرقوم ہے کہ " دیکھ وہ دن آتے ہیں خداوند کہتا ہے کہ میں اسرائیل کے گھرانے اوریہوداہ کے گھرانے کےساتھ نیا عہد باندھونگا کہ اس عہد کے موافق نہیں جومیں نے ان کے باپ دادا سے کیا جس دن میں نے ان کی دستگیری کی تاکہ زمینِ مصر سے انہیں نکال لاؤں اورانہوں نے میرے اس عہد کو توڑا اورمیں نے انہیں ترک کردیاخداوند کہتاہے۔ بلکہ یہ وہ عہد ہے جومیں اسرائیل کے گھرانے سے کرونگا۔ ان دنوں کے بعد خداوند فرماتاہے کہ میں اپنی شریعت کو ان کے اندر رکھونگا اوران کے دل پر اسے لکھونگا اورمیں ان کا خدا ہونگا اور وہ میرے لوگ ہونگے"۔اسی عبارت کے روسے بائبل کے دوسرے حصے کا نام عہدِجدید رکھا گیاہے۔

سیدنا مسیح کے کلام سے بھی یہی تعلیم ملتی ہے کہ شریعت کے عارضی حصے اور وہ حصص جو یہودیوں کی ظاہری رسوم سے تعلق رکھتے تھے اس نئے عہد کی کامل روحانیت کے زمانہ میں جو کہ وہ تمام اقوام کے ایمان داروں کے ساتھ باندھنے کو تھا بیکار ہونے والے تھے ۔ چنانچہ وہ سامری عورت کویوں فرماتے ہیں" وہ وقت آتاہے کہ تم نہ توپہاڑ پر باپ کی پرستش کروگے اور نہ یروشلم میں۔۔۔۔ مگر وہ وقت آتا ہے بلکہ اب ہی ہے کہ سچے پرستار باپ (پروردگار) کی پرستش روح اور سچائی سے کرینگے کیونکہ باپ اپنے لئے ایسے ہی پرستار ڈھونڈتا ہے ۔ خدا روح ہے اور ضرور ہے کہ اس کے پرستار روح اور سچائی سے پرستش کریں(یوحنا ۴: ۲۱تا ۲۴) اور نہ فقط یہودی ایمان دار (لوقا ۲: ۲۹تا ۳۲) بلکہ صاحبِ فہم سامری بھی خوب جانتے تھے کہ مسیح موعود یہ نیا عہد

باندھیگا - چنانچہ یوحنا ۴: ۲۵ میں سامری عورت کے جواب سے یہ بات صاف عیاں ہے۔

عبرانیوں کے خط میں حضرت یرمیاہ کی مندرجہ بالا عبارت نقل کی گئی ہے اوراس سے یہ بتایا گیاہے کہ آئندہ کے نئے عہد کا ذکر یہ ظاہر کرتاہے کہ حضرت یرمیاہ کے زمانہ میں بھی یہ بات محسوس ہوتی تھی کہ موسوی عہد پرانا ہوگیا تھا اور بتدریج اس کے عوض میں نیا عہد ہونے والا تھا(عبرانیوں ۸: ۱۳) جوکہ تورات کو منسوخ نہیں بلکہ اس کی روحانی تعلیمات کو پورا کرنے والا تھا(متی ۵: ۱۷تا۱۸)۔

حق بذاتہ ازلی وابدی ہے اور اس میں ہر گز ہر گز تغیر وتنسیخ کا امکان نہیں۔ عہدِ عتیق کی ازلی حقیقتیں ابدالآباد حق وراست رہینگی۔ عہدِ جدید نے ان حقائق کو منسوخ نہیں کیا بلکہ ایسی صورت میں ان کی تعلیم دی ہے جو نہایت صفائی اور صراحت کے ساتھ ہر زمانہ کے بنی آدم کے حالات کے موافق ہے۔ عہدِ عتیق فقط بنی اسرائیل ہی کے ساتھ تھا اور اس کی پابندی مسیح کے آنے اوراس کی سلطنت کے قائم ہونے تک ہی تھی۔ پس اس کے بعد جیسا کہ حضرت یرمیاہ نے بتایا نیا عہد مسیح کے تمام سچے اورایمانداروں یعنی روحانی بنی اسرائیل سے کیا جانے کو تھا۔ یہ ایماندار خواہ یہودی نسل سے ہوں خواہ غیر اقوام سے خدا کی نظر میں سب بنی اسرائیل ہیں۔ چنانچہ یہ عہد بخلاف موسوی عہد کے عالمگیر ہے کیونکہ موسوی عہد جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اپنے عارضی حصص اور رسوم کے لحاظ سے ایک خاص قوم کے لئے محدود تھا جو کہ اس عہد کے وسیلہ سے مسیح موعود کی شاگردی کے لئے تیار کی جارہی تھی اورا سکے فضل سے تمام اقوامِ عالم کی معلم بننے کو تھی۔ مناسب وقت پر چھلکا گر گیا اور بیج مکمل ہو کر ایک پودا بنا اور پودے نے درخت کی صورت اختیار کی کیونکہ اس کے لئے آئندہ کو چھلکے کی تنگ حدود میں محدود رہنا ناممکن تھا لیکن بیج فنا نہیں ہوگیا اوراس کی جگہ کوئی دوسرا پودا نہیں لگایا گیا بلکہ وہی بیج مکمل ہو کر درخت بن گیا۔

لہذا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ عہدِ عتیق عہد جدید سے منسوخ ہوگیا۔شاید ان رسوم اور عارضی حصص کے بارے میں جو فقط قوم یہودی کے لئے اور وہ بھی چند روزہ تھے ایسا کہہ سکتے ہیں۔ بڑھتے ہوئے پودے سے چھلکا گرادیا گیا لیکن پودا بڑھتا گیا اور پھلتا پھولتا گیا اوراب بھی اس میں خدا کے جلال کے پھل لگتے ہیں۔ پس اس حالت سے ہر گز یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ انجیل سے تورات منسوخ ہوگئی۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ گندم کا پودا اس بیج کو کشتہ کرتاہے جس سے وہ پیدا ہوتا ہے۔ اس سے بیج نیست نہیں ہوجاتا کیونکہ اس حالت میں تو کوئی پودا ہی پیدا نہ ہوسکتا پودا بیج کی اعلیٰ اور ترقی یافتہ ہستی کے قیام کا ثبوت ہے۔ اس سے بیج کی فنا ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس کی تکمیل کا ثبوت ملتا ہے۔ فقط چھلکا بیکار ہوجاتاہے کیونکہ جب روئیدگی نے خاک سے سر بلند کیا تو

چھلکا اپنا کام کرچکا۔ تب روئید گی نورِ آفتاب سے پرورش پانے لگتی ہے جو آسمان سے اس پر نازل ہوتا ہے۔

اس امر کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ تورات کے احکام دو قسم کے ہیں (۱)متعلقہ رسوم اور (۲) متعلقہ اخلاق۔ پہلی قسم کے احکام کی بجاآوری فقط یہودیوں ہی کے لئے فرض تھی اوریہودیوں پر بھی فرض نہ ہوئی جب تک کہ کوہِ سینا پر شریعت نہ دی گئی [1] ۔ان احکام کی بجاآوری عموماً حضرت ابراہیم پر فرض نہ تھی۔ حضرت ابراہیم کو فقط ختنے کا حکم ملا(اور ممکن ہے کہ اس کے ساتھ چند اور احکام بھی ملے ہوں) اور اس حقیقت پر سب متفق ہیں۔ یہ امر نہایت قابلِ غور ہے کیونکہ اس سے ظاہر ہوتاہے کہ اس قسم کے احکام کو بجالانا حضرت ابراہیم کی اولاد کے لئے بھی ہر حالت میں واجب ولازم نہ تھا۔ دیگر بنی آدم کے لئے توان کا وجود اور بھی کم ٹھہرا۔ تورات سے ہم صاف دیکھتے ہیں کہ یہ احکام حضرت ابراہیم کے زمانہ سے صدہا سال بعد دئے گئے ۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کرچکے ہیں ان احکام کے دئے جانے کے خاص کردوسبب تھے ۔(۱) یہ کہ مسیح کی سلطنت کے قائم ہونے تک بنی اسرائیل اور دیگر اقوام عالم میں ایک بین فرق ہوتا کہ وہ بت پرستی میں مبتلا ہونے کے گناہ سے جس میں تمام دنیا غرق تھی محفوظ رہیں۔(۲) یہ کہ وہ اپنے ذاتی تجربہ سے سیکھیں کہ ظاہری رسوم اگرچہ خدا کی منظوری سے بھی جاری ہوئی ہوں توبھی انسان کی روحانی ضروریات کو پورا نہیں کرسکتیں ہر چند ان کی تہ میں کوئی روحانی مقصد بھی ہو جس کی تلاش کرنا چاہیے۔ یہ تلاش اس کامل تر روحانی عبادت کے لئے تیاری تھی جس کے بارے میں انبیاء نے بہت کچھ تعلیم دی تھی(دیکھو زبور ۵۱: ۱۶ تا ۱۷) اورجس کو سیدنا مسیح نے کامل طور سے قائم کردیا ۔ یہودی شریعت کے رسمی احکام کو خداوند کریم نے غیر اقوام پر ہر گز فرض نہیں ٹھہرایا۔ جب سیدنا مسیح مردوں میں سے جی اٹھے اوراس کی سلطنت کامل طور سے قائم ہوگئی توان احکام کی بجاآوری یہودیوں پر بھی فرض نہ رہی۔

لیکن برعکس اس کے اخلاقی احکام ازلی وابدی ہیں اور ہرملک وقوم پر انہیں کی بجاآوری فرض وواجب ہے۔ یہ احکام کوہِ سینا والی شریعت میں شامل تھے۔ لیکن تخلیقِ آدم کے وقت سے تمام بنی آدم پر فرض ہیں اوران کا فرض واجب ہونا ہمیشہ قائم رہے گا۔ خدا کی شریعت کے موافق کسی زمانہ میں بھی زنا کرنا ، چوری کرنا، خون کرنا، بُت پرست بننا اور خدائِ واحد وبرحق کے سوا کسی کی عبادت کرنا جائز نہ تھا۔ یہ اخلاقی شریعت چونکہ حق سبحانہ وتعالیٰ کی ذاتِ پاک کے موافق ہے اس لئے ازلی وابدی ہے اور ہر گز ہر گزمنسوخ نہیں ہوسکتی۔ پس اس سے صاف عیان ہے کہ انجیل سے تورات کےمنسوخ ہونے کا خیال بالکل خام وباطل ہے اورایسے خیال کا باعث انجیل سے بے علم وناواقف ہونا ہے۔ انجیل تورات کومنسوخ نہیں کرتی بلکہ برعکس اس کے تورات کا ضمیمہ اوراس کی تعلیمات کی تکمیل ہے اوراسی واسطے عہدِ جدید ، عہدِ عتیق کی بہت سی آیات

---

[1] سورہ آل عمران آیات ۲ ۲، ۸۷ اوران آیات پر بیضاوی کی تفسیر

نقل کرکے ان کی تشریح وتفسیر کی گئی ہے۔ لہذا انجیل قرآن کے بیان کے موافق تورات کی تصدیق کرتی ہے۔ چنانچہ سورہ مائدہ کی ۵۰ویں آیت میں مرقوم ہے وَقَفَّيْنَا عَلَى آثَارِهِم بِعَيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَآتَيْنَاهُ الإِنجِيلَ یعنی اور پچھاڑی بھیجا ہم نے انہیں کے قدموں پر عیسیٰ مریم کے بیٹے کو۔ سچ بتاتا ہے تورات کو جو آگے سے تھی اور اس کو دی ہم نے انجیل۔

ہم اس امر کا مکرر ذکر کرتے ہیں کہ عہدِ عتیق کے جن احکام کی پیروی و پابندی مسیحیوں کے لئے واجب ولازم نہیں ہے وہ محض ظاہری رسوم سے علاقہ رکھتے ہیں اور یہ رسوم کوہِ سینا پر بنی اسرائیل کے لئے مقرر کی گئی تھیں اوران کو بھی انجیل نے منسوخ نہیں کیا بلکہ انجیل سے ان کی تکمیل ہوئی۔ مثلاً جانوروں کی قربانی کی نہایت قدیم رسم جو کہ تمام اقوام میں پائی جاتی تھی اسے خدا نے جائز ٹھہرایا اوراس کے قواعد تورات میں مقرر کئے۔ تورات میں یہ تعلیم تھی کہ مختلف موقعوں پر مختلف قسم کے جانور قربانی کئے جائیں اوران قربانیوں کی مختلف اغراض تھیں۔ ان میں ایک غرض یہ تھی کہ گناہ کا کفارہ دیا جائے لیکن پھر بھی یہ حقیقت صاف عیاں ہے کہ حیوانات کی قربانیاں انسانی گناہ کو دور نہیں کرسکتیں۔ اسی واسطے حضرت داؤد نے کہا" تو ذبیحے سے خوش نہیں ہوتا نہیں تومیں دیتا۔ سوختنی قربانی میں تیری خوشنودی نہیں"(زبور ۵۱: ۱۶) پھر عبرانیوں کے خط میں بالکل اسی کے موافق یوں مرقوم ہے " شریعت جس میں آئندہ کی اچھی چیزوں کا عکس ہے اوران چیزوں کی اصلی صورت نہیں ان ایک ہی طرح کی قربانیوں سے جو ہر سال بلاناغہ گذرانی جاتی ہیں پاس آنے والوں کو ہرگز کامل نہیں کرسکتی ورنہ ان کا گذراننا کیوں موقوف نہ ہوجاتا؟ کیونکہ جب عبادت کرنے والے ایک بار پاک ہوجاتے تو پھر ان کا دل انہیں گنہگار نہ ٹھہراتا بلکہ وہ قربانیاں سال بسال گناہوں کو یاد دلاتی ہیں کیونکہ ممکن نہیں کہ بیلوں اور بکروں کا خون گناہوں کو دور کرے۔ اسی لئے وہ مسیح دنیا میں آتے وقت کہتاہے کہ تونے قربانی اور نذر کو پسند نہ کیا بلکہ میرے لئے ایک بدن تیار کیا۔ پوری سوختنی قربانیوں اور گناہ کی قربانیوں سے توخوش نہ ہوا۔ اس وقت میں نے کہا کہ دیکھ میں آیا ہوں (کتاب کے ورقوں میں میری نسبت لکھا ہوا ہے) تاکہ اے خدا تیری مرضی پوری کروں۔ اوپر تو وہ کہتا ہے کہ نہ تونے قربانیوں اور نذروں اور پوری سوختنی قربانیوں اور گناہ کی قربانیوں کو پسند کیا اور نہ ان سے خوش ہوا حالانکہ وہ قربانیاں شریعت کے موافق گذرانی جاتی ہیں اور پھر یہ کہتا ہے کہ دیکھ میں آیا ہوں تاکہ تیری مرضی پوری کروں۔ غرض وہ پہلے کو موقوف کرتاہے تاکہ دوسرے کو قائم کرے۔ اسی مرضی کے سبب ہم سیدنا مسیح کے جسم کے ایک ہی بار قربان ہونے کے وسیلہ سے پاک کئے گئے ہیں(عبرانیوں ۱۰: ۱-۱۰) یسعیاہ نبی نے پیشتر ہی سے خدا کے برہ کی عجیب پیشینگوئی کے وسیلہ سے (یسعیاہ ۵۲: ۱۳- ۵۳) حیوانات کی ایسی قربانیوں کا روحانی مطلب سمجھا دیا۔ وہ برہِ خدا کے ازلی ارادہ

کے موافق "بنای عالم کے وقت سے ذبح ہوا ہے (مکاشفہ ۱۳: ۸) اب چونکہ
تمام جہان کے گناہوں کے لئے یہ کامل وکافی قربانی ایک بار گذرانی جاچکی ہے
اس لئے حیوانات کی قربانیوں کی کچھ ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ وہ سب
اس بڑی قربانی کا نمونہ تھیں۔ لہذا مسیحی لوگ قربانیا نہیں گذرانتے اوریہودی
بھی اب قربانیاں نہیں گذرانتے کیونکہ ان کی شریعت ان کو یروشلیم سے باہر
قربانی کرنے سے منع کرتی ہے ۔ وہ یروشلیم کی ہیکل (بیت اللہ) میں
قربانیاں گذرانتے تھے اوراب چونکہ اس ہیکل کی جگہ مسجد عمر ہے اس لئے خود
مسلمان ہی ان کو وہاں قربانی کرنے سے روکتے ہیں ۔ مسیح کے ایمانداروں
پرواجب ولازم ہے کہ حیوانات کی قربانیوں کے عوض میں اپنے جسم وجان اور
روح کو خدای حی القیوم کے لئے معقول وپاک اور زندہ قربانی گذرانیں اوراس
طرح موسوی شریعت کی سوختنی قربانیوں کے اصل مقصد کو پورا کریں (دیکھو
رومیوں ۱۲: ۱، ۲، پہلا پطرس ۲: ۱۵)۔

پھر تورات میں جسمانی طہارت کی تاکید کی گئی ہے۔ اس کے دو خاص
سبب تھے۔ اول یہ کہ خدا چاہتا ہے کہ ہم اپنے جسموں کو صاف اور صحت کی
حالت میں رکھیں کیونکہ اس نے ان کو بنایا ہے ۔ جسمانی غلاظت وناپاکی عموماً
روح کو خراب کرتی ہے۔ دوم۔ اس سے یہ غرض تھی کہ بنی آدم اپنے ذاتی تجربہ
سے دیکھ لیں کہ جسمانی طہارت روح کو گناہِ ماضی سے پاک صاف نہیں کرسکتی
اور دل کو خیالات وخواہشات کی برائی سے پاک نہیں ٹھہراتی۔لہذا ہماری
پاکیزگی کی ضرورت کو پورا کرنے میں جس کے بغیر انسان خدای تعالیٰ کے
دیدار سے فائز المرام نہیں ہوسکتا یہودی طہارت کے احکام ودستور بھی نہایت
صفائی سے بیکار وبے تاثیر ثابت ہوئے ۔ وہ روحانی پاکیزگی کے لئے محض
ایماواشارہ تھے۔ یہ روحانی اور حقیقی پاکیزگی صرف خدا کے برہ کے خون سے
حاصل ہوسکتی ہے جوایمان کے وسیلہ سے تمام گناہوں سے پاک وصاف کرتا ہے
۔ پس ہر ایک سچے مسیحی کو رسول کی ہدایت پر کاربند ہونا چاہیے۔وہ فرماتا ہے "
آؤ اپنے آپ کو ہر طرح کی جسمانی اور روحانی آلودگی سے پاک کریں اور خدا کے
خوف کے ساتھ پاکیزگی کو کمال تک پہنچائیں" (۲ کرنتھیوں ۷: ۱)
جسمانی اور روحانی دونوں طرح کی پاکیزگی ضروری ہے لیکن جسمانی پاکیزگی سے
روحانی پاکیزگی حاصل نہیں ہوسکتی۔

علاوہ برین تورات میں بنی اسرائیل کو حکم ملا تھا کہ صرف ایک ہی
مقام پر جو خدای تعالیٰ چن کر اپنے نام سے مخصوص کرے قربانیاں گذرانیں ۔
(استثنا ۱۲: ۱۳، ۱۴) تاکہ ایک طرح سے وہ خدا کا مسکن مانا جائے (استثنا
۱۲: ۵) پہلے یہ مقام شیلوہ تھا(یشوع ۱۸: ۱) اوربعد میں یروشلیم، لیکن
حضرت سلیمان جس نے ہیکل کو تعمیر کیا کہتا ہے کہ وہ فی الحقیقت خدا کا مسکن
نہ تھا بلکہ اپنے بندوں کے درمیان صرف خدا کی حضوری کی ایک علامت تھی
چنانچہ یوں مرقوم ہے کہ " کیا فی الحقیقت خدا زمین پر سکونت کریگا؟ دیکھ
آسمان اورآسمانوں کے آسمان تیری گنجائش نہیں رکھتے پھر کتنی کمی اس گھر

میں ہو گی جو میں نے بنایا" (۱۔سلاطین ۸: ۲۷) ۔ حضرت یسعیاہ نے بھی یہی تعلیم دی۔ چنانچہ اس کی کتاب میں یوں مندرج ہے "وہ جو عالی اور بلند ہے اور ابد الآباد سکونت کرتا ہے ۔ جس کا نام قدوس ہے یوں فرماتا ہے ۔ میں بلند اور مقدس مکان میں رہتا ہوں اور اس کے ساتھ بھی جو شکستہ دل اور فروتن ہے کہ عاجزوں کی روح کو جلاؤں اور خاکساروں کے دل کو زندہ کروں(یسعیاہ ۵۷: ۱۵)۔ ہمارے سیدنا مسیح کی تعلیم جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں یہ ہے کہ عبادت کی پسندیدگی ومقبولیت معبد پر موقوف نہیں بلکہ عابد کی روح پر موقوف ہے (یوحنا ۴: ۲۱تا ۲۴) ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ جب سیدنا مسیح نے اپنے آپ کو یروشلیم میں ایک کامل قربانی کے طور پر گذران دیا تو پھر آئندہ کو پہلے کی طرح کی قربانیاں گذرانے کی گنجائش نہ رہی۔ اسی لئے پھر قربانیاں گذراننے کے لئے زمین پر کوئی خاص جگہ مقرر نہ رہی۔ نئے عہد نامہ نےسیدنا مسیح کے ایمانداروں کو خواہ وہ کسی قوم کے ہوں اپنی تمام برکات اور حقوق میں شامل کرلیا ہے۔ ہر ایک سچے مسیحی کے لئے ضروری ہے کہ اپنے آپ کو خدا کی نذر کرے۔ کسی خاص مکان پر نہیں بلکہ ایک خاص شخص کے وسیلہ سے یعنی سیدنا مسیح میں ہو کر تاکہ خدای تعالیٰ کے لئے ایک زندہ قربانی ہو۔ پس قربانی کا پرانا حکم نئے اور اعلی معنی میں پورا ہو گیا اور یہ اس وقت ہوا جب اس کی لفظی بجاآوری غیر ضروری وغیرہ مفید اور ناممکن ٹھہری۔

عہدِ عتیق میں یہودیوں کے لئے تین خاص عیدیں مقرر تھیں اوران کو حکم تھا کہ ان کے سب مرد ہر سال تین بار خدای تعالیٰ کے حضور میں اس جگہ جسے وہ پسند فرمائے حاضر ہوں(خروج ۲۳: ۱۴، ۱۷ اور استثنا ۱۶: ۱۶) لیکن جب آخر کان ان رسوم کی زمانہ دراز تک پابندی کے سبب سے یہودی یوں خیال کرنے لگے کہ ان کو بجالانا اوریروشلیم کی زیارت کرنا اندرونی تعظیم وپاکیزگی کے بغیر ہی اللہ جل شانہ کی نظر میں پسندیدہ ہے اوراس طرح سے نیکیوں کا ذخیرہ جمع ہوسکتا ہے تو حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے انبیاء کو مبعوث فرما کران پر ظاہر کردیا کہ ایسے افعال اس ذاتِ پاک کی نظر میں نفرت کے لائق ہیں(یسعیاہ ۱: ۱۴تا ۱۷ عموس ۵: ۲۱) ضرورت اورکمی اس بات کی تھی کہ انسان خدای تعالیٰ کی روحانی قربت کوحاصل کرے۔ یہ روحانی قربت نئے عہد میں سیدنا مسیح کے کفارہ پرزندہ ایمان کے وسیلہ سے حاصل ہوئی (کلیسیوں ۱: ۲۰تا ۲۲۔عبرانیوں ۱۰: ۱۹تا ۲۲)۔

تورات میں ختنہ کی رسم خدای تعالیٰ اور حضرت ابراہیم اوراس کی نسل کے درمیان کے عہد کے نشان کے طور پر مقرر ہوئی لیکن اس کا مطلب یہ تھا کہ جن کا ختنہ ہوتا تھا ان کے لئے اس وعدہ پر ایمان لانا واجب ولازم ہوتا تھا کہ ابراہیم کی نسل اوراس کے بیٹے اسحاق کی اولاد سے ایک شخص ایسا پیدا ہو گا جس کے وسیلہ سے تمام اقوام عالم پر برکات ایزدی کی بارش نازل ہو گی(پیدائش ۱۷: ۱۰، ۱۴، - ۱۸: ۱۸، ۲۲: ۱۸و ۲۶: ۴) پھر یہی حکم

حضرت موسیٰ کی معرفت بنی اسرائیل کو دیا گیا (احبار ۱۲: ۳) اگرچہ اس
سے یہ مقصود نہ تھا کہ بنی اسرائیل اور غیر اقوام میں تمیز ہو کیونکہ غیر اقوام
میں سے بھی بہت سے مختون تھے۔ بیشک اس سے یہ غرض تھی کہ عباد اللہ اپنے
دلوں سے نفسانی شہوات وجذبات کودور کرنے کی ضرورت کو محسوس کریں۔
چنانچہ تورات میں صاف لکھا ہے " اپنے دلوں کا ختنہ کرو"(استثنا ۱۰: ۱۶)
اس آیت کی تشریح استثنا ۳۰: ۶ میں پائی جاتی ہے جہاں بنی اسرائیل کو
بتلایا جاتا ہے کہ خدا سے محبت رکھنا ہی بُری خواہشوں کو دور کرکے ان کے دلوں
میں پاک کریگا۔ عہد جدید کی تعلیم اس سے موافقت رکھتی ہے (رومیوں ۲:
۲۵، ۲۸، ۲۹) جب خداوند کریم نے تمام اقوام کے ایمان داروں کے
ساتھ سیدنا مسیح کے وسیلہ سے نیا عہد باندھا تو بپتسمہ اس نئے عہد کے نشان کے
طور پر مقرر فرمایا(متی ۲۸: ۱۹) یہ رسم تمام مردوزن اور خردوکلان کے
مناسب حال ہے اوراس سے بھی وہی پاکیزگی کی تعلیم ملتی ہے۔ نئے عہد نامہ
کے سبب سے نئے نشان کی ضرورت تھی اوراس بات کی ضرورت تھی کہ
مسیحیوں کو یہودیوں اور غیر اقوام سے ختنہ کرنے والوں سے بھی تمیز کیا جائے
لیکن خیال واعمال کی پاکیزگی پر اس قدر زور دیا گیا کہ اس سے پیشتر کبھی نہیں
دیا گیا تھا(فلپیوں ۳: ۵-۱۷)۔

یہودی شریعت کی اور بھی بہت سی رسوم تھیں جن سے اسی طرح
روحانی تعلیمات دینا مقصود تھا۔ جب یہ تعلیمات دی جاچکیں تو ان ظاہری رسوم
دوستوروں کی کچھ ضرورت باقی نہ رہی۔ ظاہری رسوم مضر بھی ہوسکتی ہیں کیونکہ
جن یہودیوں نے سیدنا مسیح کو قبول نہ کیا وہ ان ظاہری رسوم کے پابند تھے اور
سمجھتے تھے کہ اس پابندی کے ذریعہ سے نجات حاصل کرینگے۔ لیکن تمام اصحابِ
فہم وفراست کے نزدیک یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ ایسے معاملات میں انجیل
نے تورات کو منسوخ نہیں کیا بلکہ رسمی شریعت کے روحانی معانی کی تشریح
وتوضیح کی ہے اوراس بات پر زور دیا ہے کہ خدا کی عبادت روح وراستی سے کی
جائے۔ چنانچہ اسی مطلب کی تشریح میں سیدنا مسیح نے خود فرمایا ہے" یہ نہ
سمجھو کہ میں تورات یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے
نہیں آیا بلکہ پورا کرنے آیا ہوں کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک
آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ تورات سے ہر گز نہ ٹلیگا
جب تک سب کچھ پورا نہ ہوجائے"(متی ۵: ۱۷، ۱۸) ۔ جو کچھ ہم ابھی کہہ
چکے ہیں وہ اس امر کے اظہار کے لئے کافی ہے کہ مسیحی دین یہودی رسمی
شریعت کے ساتھ سلوک کرتا ہے۔

اخلاقی شریعت کے بارے میں ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ اس کا منسوخ
ہونا ہر حالت میں ناممکن ہے ۔ عہدِ جدید میں عہدِ عتیق کی اخلاقی شریعت پر
اور بھی زیادہ زور دیا گیا ہے اوراس کے تقاضات ومطالبات کو وسعت دی گئی ہے
مثلاً تورات خون کرنے کی ممانعت کرتی تھی(خروج ۲۰: ۱۳ واستثنا ۵:
۱۷) لیکن مسیح نے فرمایا کہ یہ حکم نہ فقط انسان کو قتل ہی کرنے سے ٹوٹتا

ہے بلکہ دل میں قہر آلودہ خیال سے بھی اس کی خلاف ورزی ہوتی ہے کیونکہ اگرایسے خیال کو روکا نہ جائے تو قتل کرنے کی خواہش تک پہنچادیتا ہے (متی ۵: ۲۱تا ۲۲) تورات میں اللہ جل شانہ نے زنا سے منع فرمایا تھا(خروج ۲۰: ۱۴واستثنا ۵: ۱۸) لیکن مسیح نے فرمایا کہ خدا کے نزدیک شہوت کی نظر اور شہوتی خیال سے بھی اس حکم کی خلاف ورزی ہوتی ہے(متی ۵: ۲۷تا ۲۸) اس نے یہ بھی فرمایا کہ اگرچہ موسیٰ نے لوگوں کی سخت دلی کے سبب سے طلاق کو جائز ٹھہرایا تھا تو بھی حولابدی سبب کے سوا کسی اوروجہ سے طلاق دیتے تھے زناکاری کے مجرم اور دوسروں کو زناکار بنانے والے ٹھہرتے تھے(متی ۵: ۳۱تا ۳۲) ۔ توریت میں اپنی قسم کھانا منع تھا اور یہ حکم تھا کہ اگر کوئی قسم کھائے تو خدا کے نام کی قسم کھائے اور اسے پورا کرے(خروج ۲۰: ۷۔واحبار ۱۹: ۱۲واستثنا ۶: ۱۳) ہمارے سیدنا مسیح کے زمانہ میں بنی اسرائیل عام گفتگومیں یونہی قسم کھانے کے عادی تھے۔سیدنا مسیح نے ان کو بتایا کہ قسم کھانے کی ضرورت گناہ سے پیداہوئی یعنی لوگوں کی دروغ گوئی کی عام عادت کے سبب سے۔اس نے ان کو تاکید کی کہ اس طرح سے بے ضرورت ہر گز قسم نہ کھائیں بلکہ بغیر قسم کھانے کے ہمیشہ سچ بولیں(متی ۵: ۳۳تا ۳۷) ۔ تورات میں یہ حکم تھاکہ ہر شخص اپنے ہمسایہ کو اپنی مانند دوست رکھے(احبار ۱۹: ۱۸) یہودی لوگ فقط اپنی قوم کے شخص کو ہمسایہ قرار دیتے تھے اورعام بول چال میں جب کبھی ان کو یہ کہنے کا موقع ہوتا تھا کہ " ہر شخص اپنے ہمسایہ کو اپنی مانند دوست رکھے" تو ساتھ ہی یہ بھی کہتے تھے" اوراپنے دشمن سے عداوت رکھے" سیدنا مسیح فرماتے ہیں کہ اپنے دشمنوں سے بھی محبت رکھو(متی ۵: ۴۳تا ۴۸) حضرت موسیٰ کے وقت میں بڑے بڑے خدا ترس لوگوں کے لئے بھی اپنے قہر وغضب پرضابط ہونا اور خون کرنے سے باز رہنا غالباً بہت مشکل تھا۔ علاوہ برین جو احکام وزدی وزناکاری اور لالچ سے منع کرتے تھے ان کی بجاآوری بھی بہت مشکل تھی لیکن گمان غالب ہے کہ سیدنا مسیح کے زمانہ میں روح القدس کی تاثیر اور انبیاء کی تعلیم کے سبب سے سب سے بُرے یہودیوں کے سوا تمام لوگوں کے لئے احکام الہیٰ کی بجا آوری ممکن ہوگئی تھی لہذا اخلاقی شریعت کی تعلیم میں ایک قدم آگے بڑھنے اوراس کے تقاضوں اور مطالبوں کو ایسے اعلیٰ درجے پر دکھانے کا موقع آگیا تھا جس کا کبھی بنی اسرائیل کے نیکترین افراد کو بھی خیال تک نہ آیا تھا۔ سیدنا مسیح کی زندگی اور نمونہ اور روح القدس کی بخشش کے سبب سے اس کے سچے ایمانداروں میں سے ادنیٰ ترین نے بھی یہ توفیق حاصل کی کہ گذشتہ زمانہ کے بہتر سے بہتر لوگوں سے بھی بڑھ کر اخلاقی شریعت کے تقاضوں کو پورا کریں۔ موسوی شریعت میں بدافعال ممنوع تھے لیکن عیسوی شریعت میں نہ فقط بد افعال بلکہ بدخیالات کی بھی ممانعت ہے۔ موسوی شریعت نواہی کی شریعت تھی اور عیسوی شریعت اوامر کی شریعت ہے یعنی موسوی شریعت میں فقط یہ کہا جاتا تھا کہ یہ مت کر۔ گناہ مت کر لیکن عیسوی شریعت اسی پر اکتفا نہیں

کرتی بلکہ کہتی ہے کہ بدی مت اور نیکی کر۔ موسوی شریعت میں نیکی کرنے سے بازرہنے سے بھی مجرم قرار پاتے ہیں۔ چنانچہ وہ سیدنا مسیح اپنی تمثیلوں میں سے ایک میں ایک لاوی اورایک کاہن (امام) کوجنہوں نے ڈاکوؤں سے مجروح شدہ مسافر کی مدد نہ کی مجرم ٹھہراتے ہیں (لوقا ۱۰: ۳۰تا ۳۷)۔ اورایک اور تمثیل میں اس نوکر کو خطا کار قرار دیتے ہیں جس نے اپنے مالک کے روپیہ کو رومال میں لپیٹ کر دفن کر چھوڑا اور حالیکہ وہ اس کو مالک کے فائدے کے لئے استعمال کرسکتا تھا(لوقا ۱۹: ۲۰تا ۲۴) موسوی شریعت نے بنی اسرائیل کو غیر اقوام سے ملنے اوران کے بُرے نمونہ کے سبب سے بت پرستی میں گرفتار ہونے سے منع کیا لیکن عیسوی شریعت نہ فقط مسیحیوں کو منکرین خدا سے جدا اوران کے بُرے نمونہ سے دوررہنے کا حکم دیتی ہے بلکہ تمام مسیحیوں سے یہ بھی طلب کرتی ہے کہ تمام اقوام عالم کو شاگرد بنائیں اور ان کو خدایِ برحق کے عرفان وعلم سے مالامال کریں۔

ایک طرح سے عہدِ عتیق اور عہد جدید میں ایک ضروری فرق ہے۔ عہدِ عتیق نے بنی آدم کو دکھادیا کہ وہ خدا کی نظر میں گناہ آلودہ ہیں اور ان کو ایک آنے والے نجات دہندہ کی آمد کا انتظار کرنے کی تاکید کی جو کہ بیت لحم میں ایک کنواری سے متولد ہونے اوراپنے لوگوں کے گناہوں کے لئے اپنے آپ کو قربان کرنے والا تھا لیکن عہدِ جدید لوگوں کو بتلاتا ہے کہ یہ وعدہ پورا ہوگیا اوران کو تاکید کرتا ہے ک اس پر ایمان لائیں جس نے تمام جہان کے گناہوں کے لئے پوری اور کامل اور کافی قربانی گذران کر کفارہ دیا ہے۔ یہ فرق بھی اس کام کی تکمیل ہے جوپیشتر کے الہام کے وسیلہ سے شروع ہوا تھا۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ خیال کریں کہ تعلیم وتہذیب کی مستقل اور متدرج ترقی کے سبب سے جو دین حضرت موسیٰ کے زمانہ میں مناسب حال تھا وہ سیدنا مسیح کے ایام میں نامناسب اور پرانا ہوگیا تھا اوراسی طرح جس دین کی مسیح نے تعلیم دی وہ بھی قریباً چھ سو برس بعد حضرت محمد کے زمانہ میں کہنہ ہوگیا اوراس امر کی ضرورت ہوئی کہ اسلام اس کی جگہ لیلے۔ اس کے جواب میں ہم تین باتیں پیش کرتے ہیں۔(۱) دینی رسوم اور دستورات پرانے اور ردی ہوسکتے ہیں اوراگرچہ پہلے مفید تھے ممکن ہے کہ بعد میں متغیر حالات کے موافق اور روحانی معانی کے خیال کے مفقود ہونے کے سبب سے بے سود بلکہ ضرررساں بھی ہوجائیں لیکن دین حق کے اصول اخلاقی شریعت کی طرح بالکل غیر متغیر اور لاتبدیل ہیں۔ اگروہ کبھی حق وراست تھے توہمیشہ حق وراست ہی رہینگے۔ موسوی شریعت کے اصول حضرت آدم ، حضرت ابراہیم اور سیدنا مسیح کے زمانہ میں بھی حق وراست تھے۔ وہ اب بھی حق وراست ہیں اور روزِ قیامت تک بلکہ اسکے آگے تک ایسے رہینگے لہذا دین حق کے اصول نہ کبھی تبدیل ہوتے ہیں نہ کبھی ردی وبیکار ہوسکتے ہیں۔(۲) اگر تعلیم وتہذیب کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ دینی رسوم وخیالات میں بھی ترقی ہو اور اگرہم بفرضِ محال مان بھی لیں کہ حضرت محمد کا زمانہ اورملک سیدنا مسیح کے زمانہ اورملک سے تعلیم

وتہذیب کے لحاظ سے بدرجہا برتروبہتر تھے تو صاف ظاہر ہے کہ اسلام ترقی یافتہ بنی آدم کے لئے مناسب حال اور خدا کا آخری الہام ہونے کے قابل ٹھہرنے کے لئے ضرور ہے کہ کم از کم اخلاق وروحانیت میں اور بہت سی بے سود رسوم سے آزاد ہونے میں مسیحیت سے ایسا ہی اعلیٰ وبالا ہوجیسی کہ مسیحیت ان امور کے لحاظ سے یہودیت سے اعلیٰ وافضل ہے۔ جو لوگ عہدِ عتیق اور قرآن کی تعلیمات سے واقفیت رکھتے ہیں اور آرزوؤں اور آلایشوں کے لحاظ سے ہر زمانہ میں یکساں ہے۔ چونکہ ہر زمانہ میں یکساں ہے اس لئے اس امر کا محتاج ہے کہ خدا کی پاک روح کی تاثیر سے پاکیا جائے۔ ہر زمانہ میں انسان گناہ کی طرف راغب ہے اوراس لئے خداوند کریم کی قربت میں پہنچایا جانے کا محتاج ہے اور یہ کام فقط خدا کی محبت ہی کے مکاشفہ سے ہوسکتا ہے۔رسول کے یہ الفاظ کہ " ہم اس سے اس لئے محبت رکھتے ہیں کہ اس نے پہلے ہم سے محبت رکھی" انسان کو خدا کی قربت میں لانے اوراس کے خالق سے میل کرانے میں نہایت اعلیٰ درجہ کی کامیابی کا اظہار کرتے ہیں۔جس انسان کادل مسیح پر ایمان لانے کے وسیلہ سے اس طرح سے خدا کی نزدیکی حاصل کرچکا ہو اس سے بڑھ کر اعلیٰ وخود نثار اور خدا کی عبادت وخدمت میں مصروف خیال میں نہیں آسکتا۔

یہ بے بنیاد وہم کہ بائبل منسوخ ہوگئی ہے خدای تعالیٰ کے انبیاورسل کے صاف بیان اور سیدنا مسیح کے فرمان سے جو کہ بائبل میں مندرج ہے بالکل ٹھہرتا ہے۔ مثلاً عہدِ عتیق کے بارے میں حضرت یسعیاہ یوں کہتا ہے کہ گھاس مرجھاتی ہے پھول کملاتے ہیں پر ہمارے خدا کا کلام ابد تک قائم ہے"(یسعیاہ ۴۰: ۸) سیدنا مسیح بھی یہی حقیقت سکھاتے ہیں کہ عہدِ عتیق ہر گز منسوخ نہ ہوگا بلکہ اس کی ادنیٰ سے ادنیٰ اصولی تعلیم بھی جب تک جہان قائم ہے قائم رہیگی(متی ۵: ۱۸) وہ اپنے کلماتِ بابرکت کے بارے میں بھی یہی تعلیم دیتا ہے۔ چنانچہ انجیل شریف میں مرقوم ہے" آسمان اور زمین ٹل جائیں گے لیکن میری باتیں ہر گز نہ ٹلیں گی(متی ۲۴: ۳۵، مرقس ۱۳: ۳۱۔ لوقا ۲۱: ۳۳)۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سیدنا مسیح اس مقام پر فقط یہ فرماتے ہیں کہ میرا کلام اس وقت تک قائم رہے گا جب تک تائیتس یروشلیم کو نہ لیلے(۷۰ء)۔ عہدِجدید کے پڑھنے والوں پر یہ بات صاف عیاں ہے کہ ان ہرسہ اناجیل کے مندرجہ بیان کے موافق وہ ان الفاظ کے کہنے سے پہلے اپنی دوسری آمد اور روزِ قیامت کا ذکر کررہے تھے(متی ۲۴: ۳۰تا ۳۱۔ مرقس ۱۳: ۲۶تا ۲۷۔ لوقا ۲۱: ۲۷تا ۲۸) نہ اس نے ان ہولناک واقعات کے بیان کے سلسلہ میں فرمایا تھا کہ ان کے بعد بھی میرا کلام قائم[1] رہیگا۔ انجیلِ یوحنا کے بارھویں باب کی ۴۸ویں آیت سے سیدنا مسیح کے اس فرمان کی تشریح ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں" جومجھے نہیں مانتا اور میری باتوں کو قبول نہیں کرتا اس کا ایک

---

[1] قرآن میں بھی اس کے موافق مندرج ہے کہ خدا کا کلام لاتبدیل ہے(سورہ انعام آیت ۳۴، ۱۱۵ ۔ سورہ یونس آیت ۶۵ ۔ سورہ کہف آیت ۲۶۔

مجرم ٹھہرانے والاہے یعنی جو کلام میں نے کیاہے آخری دن میں وہی اسے مجرم ٹھہرائیگا" اس صاف اور صریح کلام میں ہر گزہر گز غلط فہمی کا امکان نہیں ہے۔ آخر کار اس کے کلام سے ہم سبھوں کا انصاف ہو گا۔ لہذا اس کی تعلیمات مندرجہ انجیل منسوخ نہیں ہوئیں اور ہر گز منسوخ نہیں ہوسکتیں بلکہ ہم کو بتلایا گیاہے کہ کوئی انسان یا انسان سے بڑھ کر کوئی فرشتہ بھی آسمان سے آکر مسیح کی انجیل کے سوا کوئی اور پیغام سنائے تو وہ ملعون ہوگا(گلتیوں ۱: ۸تا ۹) یہی وجہ تھی کہ جب مانی نے فارقلیط ہونے کا دعویٰ کیا توسچے مسیحیوں نے اس کو قبول نہ کیا اور اسی سبب سے انہوں نے عہدِ جدید کے الہام کے سوا کبھی کسی اور بعد کے کلام کو الہامِ خدا نہیں مانا۔

اس مقام پر یہ یادرہے کہ مسیح کے پیغام کی استقامت کے بارے میں اس کا یہ کلام اورہی قسم کا ہے۔ یہ اس کے باقی ملفوظ الفاظ یا عہدِ عتیق وجدید کے مکتوب الفاظ کی مانند نہیں۔ عہدِ عتیق وجدید میں بھی قرآن اور دیگر قدیمی کتابوں کی طرح اختلاف قرات موجودہے لیکن اس سے عہدِ عتیق یا عہدِ جدید کی تعلیم یا اصول اخلاق میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں ہوتی۔

بعض نے یوں کہاہے کہ سیدنا مسیح کے کلام کا یہ مطلب ہونا چاہیے کہ موسوی رسمی شریعت ہر گز منسوخ نہیں ہو گی لیکن اس کا جواب ہم دے چکے ہیں کہ۔ تورات کے رسمی احکام بے شک منسوخ نہیں ہوئے بلکہ جیسا خود سیدنا مسیح نے فرمایاہے کہ ان کی تکمیل ہو گئی ہے(متی ۵: ۱۷) اس کی تشریح میں دیکھئے وہ روزہ رکھنے کے بارے میں کیا فرماتےہیں۔ روزہ رکھنے سے کسی نبی نے کبھی منع نہیں کیا اگرچہ کسی جگہ روزہ رکھنے کا صاف حکم بھی نہیں ہے اور یہودی اس کی بہت قدر کرتے تھے(متی ۶: ۱۶تا ۱۸)۔

یہ بھی کہا جاتاہے کہ سیدنا مسیح کا متی ۱۰: ۵ والا حکم اور متی ۱۵: ۲۴ کا بیان متی ۲۸: ۱۹و ۲۰ سے منسوخ ہوگئےہیں۔ لیکن وہ احکام جو کسی خاص عرصہ کے لئے ہوں جب ان کی پوری تعمیل ہوچکے توان کو منسوخ شدہ نہیں کہہ سکتے۔ سیدنا مسیح کے متی ۲۸: ۱۹، ۲۰ والے بیان کی اس سے صاف تصدیق ہوتی ہے کہ اس ایک موقع کے سوا جو متی ۱۵: ۲۴ میں مندرج ہے وہ اپنی زمینی زندگی کے ایام میں غالباً کبھی اپنے ملک کی حدود سے باہر نہیں گیا۔

اب ہم ان واقعات کی طرف متوجہ ہوتےہیں جن کا بائبل میں ذکر ہے۔ ہم دیکھتےہیں کہ ان کا منسوخ ہونا کسی طرح سے ممکن نہیں ہے کیونکہ تمام اصحابِ فہم وفراست خوب جانتےہیں کہ ہر ایک واقعہ کا بیان یا راست ہے یا ناراست ۔ ممکن ہے کہ ہم اس کی راستی وحقیقت کو قائم کرنے کے لئے ثبوت ودلیل طلب کریں لیکن جو کچھ حق ہے وہ کسی صورت سے بھی باطل نہیں ٹھہریگا اور جو کچھ وقوع میں آچکاہے وہ کبھی دنیا کی تواریخ کے صفحوں سے ایسے طور پر محو نہیں کیا جاسکتا کہ گویا کبھی وقوع میں آیا ہی نہ تھا۔ اس مضمون پر زیادہ لکھنا بالکل غیر ضروری معلوم ہوتاہے۔

پس ہمارے خیال میں یہ امر نہایت صفائی اور صراحت کے ساتھ ثابت ہوچکا ہے کہ عہدِ عتیق اور عہدِ جدید کی اصولی تعلیمات ایسی ہیں کہ ان میں کسی طرح سے تبدل و تنسیخ کا امکان نہیں ہے کیونکہ خدایِ تعالیٰ کی مرضی اور ذات میں تغیر وتبدل امرِ محال ہے۔ لہذا راہ نجات ہمیشہ ایک ہی ہے اور قیامت کے روز تمام بنی آدم کا انصاف سیدنا مسیح کی تعلیمات کے موافق ہوگا جس کے ایام کو حضرت ابراہیم ایمان کی آنکھ سے دیکھنے کو خوش تھے[1] اور جس پر ایمان لانے کے وسیلہ سے خود حضرت ابراہیم اور تمام انبیا کے لئے نجات حاصل کرنا ممکن ٹھہرا۔

[1] یوحنا۸: ۵٦

تیسرا باب

عہدِ عتیق اور عہدِ جدید جو آجکل مروج ہیں وہی ہیں جو حضرت محمد کے زمانہ میں یہود و نصاریٰ کے پاس موجود تھے اور جن پر قرآن شہادت دیتا ہے

تیسرے اور چوتھے باب میں ہم اس سوال پر غور کرینگے کہ وہ کُتبِ عہد عتیق جو آج کل یہود و نصاریٰ میں مروج ہیں اور کُتبِ عہد جدید جو نصاریٰ میں رائج ہیں کیا وہی ہیں۔ جو حضرت محمد کے زمانہ میں موجود تھیں ؟ اور اگر وہی ہیں تو کیا کسی حد تک وہ محرفہ وتبدیل شدہ ہیں ؟ اس سے پیشتر کہ جو شہادت اس امر پر ملتی ہے ہم اسے جانچیں فرض کیجئے کہ یہ بات جو اسلامی ممالک کے ناواقف مسلمانوں میں بہت رواج پا گئی ہے صحیح ہے اور (۱) یہ کہ موجودہ کتب مقدسہ وہی نہیں ہیں جو کہ حضرت محمد کے زمانہ میں تھیں یا (۲) یہ کہ کم از کم ان میں ایسی تحریف وتخریب ہو گئی ہے کہ اب وہ اعتماد کے قابل نہیں ہیں۔ اگر یہ سچ ہے کہ تو تمام بنی آدم کی حالت ازبس تباہ ہے کیونکہ ہماری عقل میں یہ اظہر من الشمس ہے کہ کلامہ اللہ بھی مشیت ایزدی کی طرح لاتبدیل اور غیر متغیر ہے۔ وہ کلام انبیاء کے وسیلہ سے سنایا گیا جیسا کہ قرآن

تعلیم دیتا ہے اوراہلِ اسلام کو حکم ہے کہ اس پر ایمان لائیں۔(سورہ بقرہ آیت ۱۳۰ ۔ سورہ آل عمران آیت ۷۸) پس اگر کلام اللہ بنی آدم سے بالکل مفقود ہو گیا ہے یا اس میں ایسی تحریف وتخریب ہوچکی ہے کہ اعتماد وثوق کے قابل نہیں رہا تو بنی آدم کی بدحالی کا کون اندازہ لگاسکتا ہے ؟ اور قرآن مہیمن[1] ومحافظ ہونے میں کیسا کلیتہً بے تاثیر ٹھہرتا ہے ایسی حالت میں خود قرآن کا کیا حال ہے اوراہلِ اسلام کیونکر قرآن پر اعتماد کرسکتے ہیں جبکہ اس سے وہ کام نہ ہوسکا جو ان کے ایمان واعتقاد کے موافق خدای تعالیٰ نے اس کے سپرد کیا تھا؟

لیکن الحمد اللہ کہ کلام اللہ نیست نہیں ہوا اور نہ ہی اس میں تحریف وتخریب ہوئی ہے۔ خدای تعالیٰ نے خود اپنے کلام کی محافظت کی ہے۔ یہاں تک کہ جستجو مسلمانوں کو قرآن سے بھی مدد ملتی ہے کہ بائبل کو کلام اللہ تسلیم کریں۔

پھر بھی نہایت حیرانی کی بات ہے کہ بائبل کے بارے میں جو کچھ قرآن بیان کرتا ہے کہ اکثر اوقات ہم مسیحیوں کو اس کی صداقت کو قائم کرنے کا کام کرنا پڑتاہے۔ اور اس طرح سے گویا ہم بعض مسلمان مخالفوں کے ہاتھ سے قرآن کو بچاتے ہیں۔ ایسے مسلمان یہ نہیں سمجھتے کہ بائبل پر حملہ کرنا خود قرآن پر حملہ کرنا ہے جو کہ بائبل کی تصدیق کرتا ہے اوراس کی حفاظت کا ذمہ وار ہے ۔ اس طرح سے وہ محض کوتاہ اندیشی کے سبب سے اپنی ہی معزز کتاب کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

مثلاً شیخ حاجی رحمت اللہ دہلوی اپنی کتاب اظہار الحق مطبوعہ ۱۲۸۴ ہجری میں لکھتاہے کہ دہلی میں بعض علما نے ۱۲۷۰ ہجری میں ایک فتویٰ لکھا اور اس میں یوں کہا ان ھذا المجموع المشتہر الاٰن بالعھد الجدید لیس بمسلمہ عند ناولیس ھذا اھولاانجیل الذی جاء ذکرہ فی القرآن بل ھوعند نا عبارۃ عن الکلامہ الذی انزل علےٰ اعیسیٰ[2] یعنی یہ کتابوں کا مجموعہ جو کہ اب عہدِ جدید کے نام سے مشہور ہے ہمارے نزدیک مسلم نہیں ہے اور یہ وہ انجیل نہیں ہے جس کا قرآن میں ذکر آیا ہے بلکہ بخلاف اس کے ہمارے خیال میں موخر الذکر سے وہ کلام مراد ہے جو کہ عیسیٰ پر نازل کیا گیا تھا۔ رحمت اللہ خود بھی تعصب کے سبب سے اسی غلطی میں گرفتار ہے کیونکہ وہ کہتا ہے کہ اصلی تورات اوراصلی انجیل دونوں کی دونوں حضرت محمد کی رسالت سے پیشتر ہی مفقود ہو گئی تھیں اور جواب

[1] سورہ مائدہ کی آیت ۵۲ میں مرقوم ہے وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ یعنی اور تجھ پر اتاری ہم نے کتاب تحقیق سچا کرتی ہے سب اگلی کتابوں کو اوراس پر محافظ۔ آخری دو الفاظ یعنی وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ پر بیضاوی یوں لکھتا ہے ۔ رقیباً علی سائر الکتب یحفظہ عن التغیر و یشھد لہ بالصحۃ والثبات وقری علیٰ بینۃ المفعول ای ھومن علیہ وحوفظ من التحریف والحافظہ لہ ھواللہ الحافظ فی کل عصر۔ جلالین نے مہیمناً کا ترجمہ شاہداً کیاہے۔ عباسی کہتاہے کہ شھیداً علیہ علی الکتب کلما۔ جو قرآن ہندوستان میں ۱۲۹۹ ہجری میں ہاشمی مطبع میں طبع ہوا اس کے بین السطور کے فارسی اور اردو ترجمہ میں نگہبان درج ہے۔ قرآن مطبوعہ طھران ۱۳۱۲ ہجری میں گواہِ راست لکھاہے۔ لفظ کی صورت فی الحقیقت ارامی ہے۔

[2] اظہار الحق صفحہ ۱۴۴، ۱۴۵ (۲) اظہار الحق صفحہ ۱۴۲

موجود ہیں وہ سچی جھوٹی کہانیوں کا مجموعہ ہیں اور ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کتابیں حضرت محمد کی رسالت کے زمانہ تک صحت کی حالت میں موجود تھیں اور بعد میں دونوں میں تحریف وتخریب ہوئی ۔ ہر گز نہیں۔ بیشک یہ مصنف جب اصلی تورات اور اصل انجیل کاذکر کرتا ہے تو ہر گز ہر گز پہلے مسودہ کی طرف اس کا اشارہ نہیں ہے کیونکہ قرآن کا بھی پہلا مسودہ ضائع ہوچکا ہے ۔لاریب اس کی مراد ان پہلے اور اصلی نسخوں کے مندرجہ مضامین سے ہے۔ لہذا اس کا مندرجہ بالا بیان بالکل غلط ہے کیونکہ نہ فقط مسیحی بلکہ زمانہ حال کے تمام تعلیم یافتہ ہندوستانی مسلمان اس بات کو تسلیم کرینگے کہ حضرت محمد کے زمانہ میں یہود ونصاریٰ کے پاس وہی تورات وانجیل موجود تھی جو اب موجود ہے۔ زمانہ قدیم میں لاعلمی کے سبب سے لوگ اس قسم کے لایعنی بیانات کرکے معذور ہوسکتے تھے لیکن اب ایسے عذر کی گنجائش نہیں ہے۔

شیخ رحمت اللہ جہلا کو یہ منوانے کی کوشش کرتا ہے کہ جب ۵۸۷ سال قبل از مسیح نبوکد نصر نے ہیکل کو برباد کیا تورات بالکل نیست ہوگئی تھی اور اس کے ثبوت میں وہ ایک جعلی کتاب[1] تالیف کی اور کہا کہ یہی حضرت موسیٰ والی اصل تورات ہے۔ لیکن جب ہم اس بے بنیاد جعلی کتاب کو دیکھتے ہیں تو اس میں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جس سے شیخ صاحب کے بیان کی تصدیق وتائید ہو بلکہ برعکس اس کے اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے (۱۴ : ۲۱تا ۲۲) کہ عزیر نے اپنے منشیوں سے وہ سب کچھ لکھوایا جو ابتدای عالم سے دنیا میں وقوع میں آیا تھا اور جو کہ تیری تورات میں مرقوم تھا" یعنی اس بیان کے موافق عزیر تورات کا حافظ تھا اور جب اس نے اپنے منشیوں سے تورات لکھوائی تو اس نے کوئی جعلسازی نہیں کی اور کوئی جعلی الہام نہیں لکھوایا ۔ بیضاوی سورہ توبہ کی ۲۳ویں آیت کی تفسیر میں ایک قصہ درج کرتا ہے جو اگرچہ بالکل بے حقیقت وبے بنیاد ہے تو بھی ہمارے مندرجہ بالا بیان کی تائید وتصدیق اور شیخ رحمت اللہ کے بیان کی تردید کرتا ہے۔ بیضاوی کہتا ہے کہ چونک نبوکد نصر کے حملہ کے بعد یہودیوں میں کوئی ایسا شخص باقی نہ رہا تھا جس کو تورات حفظ ہو اس لئے جب خدای تعالیٰ نے ایک سوسال کے بعد عزیر کو زندہ کیا اور اس نے توارت لکھوائی تو یہودیوں نے اس پر تعجب کیا۔ ایسی حالت میں یہودیوں کے تعجب کی کوئی وجہ نہ تھی۔ لیکن اگر کوئی ایسے بے بنیاد قصہ کو سچ مان لے تو بیشک تعجب کی بات ہوگی۔ اس جعلی کتاب میں بھی کوئی ایسی بے بنیاد اور لچربات مندرج نہیں ہے لیکن یہ مذکورہ بالا جعلی کتاب اور بیضاوی دونوں اس امر میں متفق ہیں کہ عزیر تورات کا حافظ تھا اور جعلی تورات کا محافظ نہیں تھا اور جعلی تورات کا مولف نہیں تھا۔ اگر ایسدرس دوم کی مندرجہ کہانی سچی ہو تو اس سے ثابت ہوگا کہ جس طرح سے قرآن کے تمام موجودہ نسخوں کے جل جانے سے قرآن نیست نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کے بہت سے حافظ موجود ہیں جو کہ دوسروں کو پھر لکھواسکتے ہیں ۔ اسی طرح سے

[1] بعض اس کو ایسدریس کی دوسری اور بعض چوتھی کتاب کہتے ہیں۔

توارت بھی نیست نہ ہوئی کیونکہ عزیر کوحفظ تھی اوراس نے اسے لکھوایا۔ اس سے توارت کا نیست ہونا ثابت نہیں ہوتا جیسا کہ شیخ رحمت اللہ کا وہم ہے۔

اس مقام پر یہ بتلانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کوئی عالم بھی ایسدرس کی دوسری یا چوتھی کتاب کو عزیر کی تالیف نہیں مانتا۔ اس کے مندرجہ مضامین سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس کا پہلا حصہ ۸۱ء اور ۹۲ء کے مابین لکھا گیا ہے اور آخری حصہ ۲۶۳ء میں حالانکہ عزیر سیدنا مسیح سے بعد کی تصنیف ہے اور پیشتر کی نہیں ۔ اس کتاب کو یہودیوں نے کبھی قبول نہیں کیا۔ یہودی لوگ دوسری اقوام کے علما کے ساتھ متفق ہوکر اس کتاب کے افسانہ کو رد کرتے ہیں اگرچہ سنہ عیسوی کی تیسری صدی میں بعض مسیحی جو عبرانی زبان سے بالکل ناواقف تھے اس کتاب سے فریب کھاگئے۔

اب ہم کو یہ دکھلانا ہے کہ توارت اور یہودیوں کی دیگر قدیمی کُتب مقدسہ نبوکد نصر کے عہد میں برباد نہیں ہوئیں اور اگرہم یہ ثابت کردیں کہ وہ عزیر (عزرا) کے زمانہ میں یعنی اہل بابل کے ہیکل کو برباد کرنے کے سو سال سے زائد عرصہ کے بعد موجود تھیں تو یہ امر اظہر من الشمس ہوجائیگا اور یہ ثابت کرنا کچھ مشکل نہیں ہے کیونکہ عزیر کی اصل کتاب میں جو کہ یہود ونصاریٰ دونوں کی کُتب مقدسہ میں شامل ہے صاف مرقوم ہے کہ " عزرا موسیٰ کی شریعت میں جسے خداوند بنی اسرائیل کے خدا نے دیا تھا ماہر تھا"(عزرا ۷: ۶) اور یہ بھی لکھاہے کہ جب عزرا یا عزیر بابل سے یروشلیم کی طرف روانہ ہوا تو توارت اس کے ہاتھ میں تھی (عزرا ۷: ۱۴) پس صاف ظاہر ہے کہ توریت نبوکد نصر کے عہد میں برباد نہیں ہوئی۔ یہ بائبل کی شہادت کافی ہے لیکن اس کے علاوہ اور شہادت بھی موجود ہے۔ پرقی ابھوت ایک عبرانی کتاب ہے جو کہ سنہ عیسوی کی دوسری صدی کی تصنیف بیان کی جاتی ہے۔ اس کتاب میں مرقوم ہے " موسیٰ[1] نے کوہِ سینا پر توارت کو پایا اور یشوع کے سپرد کیا اور یشوع[2] نے بزرگوں کے حوالے کیا اور بزرگوں سے انبیاء کو پہنچی اور انبیاء نے بڑی ہیکل والوں تک پہنچایا۔ بڑی ہیکل سے علما کی ایک جماعت مراد ہے جسے عزرا نے قائم کیا اور تمام علما کا فرضِ اول یہ تھا کہ توارت کی محافظت کریں اوراس کی تعلیم دیں۔ تالمود میں لکھاہے کہ بابل کی اسیری کے بعد ان علما نے توارت کو پھر پہلی اصل حالت میں قائم کیا۔ اسی کے مطابق پرقی[3] ابھوت میں مرقوم ہے کہ " یہ علما تین باتیں کہا کرتے تھے ۔(۱) فیصلہ کرنے میں ہوشیار رہو(۲) بہت سے شاگرد بناؤ اور (۳) توریت کی حفاظت کر"۔ اس تیسری بات کا مطلب یہ ہے کہ ایسے وسائل کام میں لاؤ جن سے توارت تحریف وتخریب اور ہر طرح کے نقصان سے محفوظ رہے"۔ یہ کام نہایت ہوشیاری سے کیا گیا ہے۔ کسی قوم نے اپنی دینی کتب کی ایسی

---

[1] پرقی ابھوت ۱: ۱

[2] ان بزرگوں کا ذکر یشوع ۲۴: ۳۱ میں ملتا ہے۔

[3] پرقی ابھوت ۱: ۱

ہوشیاری سے حفاظت نہیں کی جیسی کہ یہودیوں نے ازمنہ سالفہ میں اپنی کُتُبِ دین کی محفاظت کی ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنی کُتُب مقدسہ کی عبارات کے الفاظ اور حروف کا بھی حساب رکھا ہے۔ پرتی ابھوت سے ہم ایک عبارت اور نقل کرتے ہیں اور اس سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ یہودیوں کی نظر میں تورات کی کیا قدر ومنزلت تھی۔ چنانچہ مرقوم ہے کہ " شمعون[1] عادل علما کی جماعت میں سے تھا ۔ وہ کہا کرتا تھا کہ دنیا تین چیزوں کے سبب سے قائم ہے یعنی تورات عبادت اور رحمت کے کاموں کے سبب سے ۔ یہودیوں میں عہدِ عتیق عبرانی وارامی زبان میں نہایت حفاظت اور عظمت کے ساتھ پشت درپشت چلاآیاہے۔ اس امر کا ایک ثبوت یہ ہے کہ عہدِ عتیق کے مختلف حصوں کا طرز کلام مختلف ہے جس سے یہ ظاہر ہے ہوتا ہے کہ یہ کسی ایک آدمی یا ایک زمانہ کی تصنیف نہیں ہے علاوہ بریں بعض واقعات جو کوئی خاص روحانی معنی نہیں رکھتے ان کے مختلف بیانات میں ظاہری تضاد پایا جاتا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس ظاہری تضاد کو دور کرنے کی خاطر یہودیوں نے اصلی عبارت کو تبدیل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس دلیل کی مضبوطی کی تفہیم کے لئے ہم قرآن سے ایک مثال پیش کرتے ہیں ۔ چنانچہ سورہ آل عمران کے چھٹے رکوع کی پہلی آیت میں مرقوم ہے يَا عِيسَى إِنِّي مُتَوَفِّيكَ

[1] پرتی ابھوت ۱ : ۲

وَرَافِعُكَ إِلَيَّ یعنی اے عیسیٰ میں تجھے وفات دونگا اوراپنی طرف اٹھالونگا۔ پھر سورہ نساء کے ۲۲ویں رکوع میں سیدنا مسیح کی بابت لکھاہے وَإِن مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلاَّ لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ یعنی اور جو فرقے ہیں کتاب والوں میں سواس پر یقین لائینگے اس کی موت سے پہلے بعض لوگ دوسری ضمیر کے بارے میں شک میں ہیں کہ اس سے خداوند مسیح مراد ہے یا نہیں لیکن اس میں شک کی بالکل گنجائش نہیں۔ سورہ مریم میں جہاں اس کی موت کا ذکر ہے ۔ وہ یوں کہتا ہوا پیش کیا گیا وَسَلَامٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا یعنی اورسلام ہے مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن مروں اور جس دن جی اٹھوں (سورہ مریم آیت ۳۴) لیکن سورہ نساء کی مندرجہ بالاآیات سے پہلی دوآیتوں میں اس امر کا صاف انکار ہے کہ یہودیوں نے اسے مارڈالا۔ چنانچہ مرقوم ہے ۔ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ یعنی انہوں نے نہ اسے قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا۔ ان آیات کو دیکھنے سے بادی النظر میں ایسا معلوم ہوگا کہ متضاد وتعلیمات مندرج ہیں کیونکہ بعض مقامات سیدنا مسیح کی موت کو قائم کرتے ہیں اور بعض اس کاانکار کرتے ہیں لیکن اس ظاہری تضاد کا قرآن میں پایا جاتا ہے اس امر کا ثبوت ہے کہ مسلمانوں نے قرآن میں تحریف نہیں کی اگرچہ بیضاوی[2] قبل موتہ کی جگہ قبل موتھم لکھتا ہے۔ پس بائبل کے ظاہری تضاد کا

[2] جلد اول صفحہ ۲۴۱

بھی یہی حال ہے ایسے تضاد کی موجود گی ہی اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ اس کو دور کرنے کے لئے اصل عبارت میں کس طرح کے تغیر وتبدل کی کوشش نہیں کی گئی۔

بعض مصنفینِ اسلام نے عبارات کی بڑی بڑی فہرستیں تیار کرکے یہ کہنے کی جرات کی ہے کہ ان میں نہایت سخت قسم کا متناقض پایا جاتاہے ۔ لہذا عہد عتیق میں ایسا تناقض موجود ہے لیکن جیسا کہ ہم قرآن سے ایک مثال پیش کرچکے ہیں یہ فقط ظاہری تناقض ہیں ۔ اگر ان حالتوں میں بغور مطالعہ کرنے سے ان بظاہر متناقض عبارات کی باہمی مطابقت صاف سمجھ میں آجاتی ہے ۔ مگر جب مطابقت سمجھ میں نہیں آتی تو اس کا سبب یہی ہوتا ہے کہ ہم تمام متعلقہ حالات سے واقف نہیں ہوئے۔ لیکن ایسے تضاد وتناقض کی ہستی اس امر کا نہایت بین ثبوت ہے کُتب مقدّسہ کی از حد تعظیم کرتے تھے اورانہوں نے ہر گز ہر گز کوشش نہیں کی کہ کسی طرح کی تبدیلی کرکے تضاد وتناقض کو دور کریں تاکہ ان کے تعصب مخالفین جو کہ بجای حق جوئی اپنی ہوشیاری اورچالاکی دکھانے کے مشتاق ہیں کوئی اعتراض نہ کرسکیں۔ انسان جب چاہے یوں کرسکتا ہے کہ دوپہر کے وقت بھی اپنی آنکھیں بند کرلے اور جو نور خدا بخشتا ہے اسے نہ دیکھے لیکن جو کوئی تاریکی میں چلنا پسند اور اختیار کرتا ہے ضرور گمراہ ہوگا۔

اب ہم نہایت اختصار کے ساتھ اس امر کا ثبوت پیش کرینگے کہ کُتب مقدسہ عہدِ عتیق وجدید جو کہ آج کل مروج ہیں وہی ہیں جو حضرت محمد کے ایام میں اہلِ کتاب کے پاس موجود تھیں اور جن کے حق میں قرآن نہایت صفائی اور صراحت کے ساتھ شہادت دیتاہے ۔ ہمارے پاس کُتب عہد عتیق کی ہیں اوران میں وہ سب کتابیں مندرج ہیں جو کہ اب عبرانی عہدِ عتیق میں پائی جاتی ہیں۔ یوسیفس یہودی مورخ نے قریباً ۹۰ ء میں یوں لکھاہے" ہمارے پاس بیشمار متضاد ومتناقض کتابیں نہیں ہیں بلکہ فقط بائیس کتابیں ہیں جن میں تمام زمانوں کی تواریخ مندرج ہے اور وہ نہایت صحیح طور سے الہامی مانی جاتی ہیں۔ ان میں سے [1] پانچ موسیٰ کی ہیں اور ان میں شریعت اور موسیٰ کی موت تک کے زمانہ کی انسان کی نسل کی تواریخ مرقوم ہے اور یہ عرصہ تین ہزار سال سے تھوڑا ہی سا کم ہے۔ موسیٰ کی موت کے ایام سے فارسی بادشاہ اور شیر درازدست کے عہدِ سلطنت تک انبیاء نے موسیٰ کے بعد اپنے زمانہ کے واقعات کو تیرہ کتابوں[2] میں قلمبند کیا۔ باقی چار[3] کتابوں میں خدای تعالیٰ کی حمدو ثنا اور بنی آدم کے لئے اخلاقی ہدایات مندرج ہیں"(۹۰ء) میں جو جمنیا میں علما کا جلسہ ہوا اس میں بھی یہی فہرست قرار پائی تھی۔ بعد ازاں ۳٦۳ء میں لوڈیسیا میں ایک جلسہ منعقد ہوا اوراس میں بھی وہی بائیس کتابیں کتب عہد

---

[1] پیدائش، خروج، احبار، گنتی، استثنا۔

[2] یشوع، قاضی اور روت۔ سیموئیل اور سلاطین، تواریخ، عزرا اور نحمیاہ۔آستر ایوب۔ ۱۲ صحف انبیاء صغیر یسعیاہ۔ یرمیاہ بانوحہ حرقی ایل دانی ایل

[3] زبور امثال، واعظ، غزل الغزلات

عتیق کا مجموعہ مذکور ہیں۔ پھر بعد کے زمانہ میں تسہیل کے خیال سے ان میں سے بعض کتابوں کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور اکثر حالتوں میں ہم بالکل صحت کے ساتھ دریافت کرسکے ہیں کہ یہ تقسیم کب ہوئی ۔ چنانچہ سینٹ پیٹرز برگ میں جو کتاب عبرانی زبان میں لکھی گئی (۹۱۶ء) اس میں بارہ[1] چھوٹے نبیوں کے صحیفے ایک ہی کتاب کی صورت میں ہیں اور ہر ایک صحیفہ ایک باب کے طور پر ہے۔ ان بارہ صحیفوں کی آیات کو گن کر شمار ایک جگہ درج کیا گیا ہے۔ سیموئیل ، سلاطین اور تواریخ کا دودو کتابوں میں تقسیم کیا جانا اور عزرا و نحمیاہ کا جدا جدا ہونا ۱۵۱۶ء اور ۱۵۱۷ء میں وقوع میں آیا تھا جب عہد عتیق عبرانی زبان میں وینس میں چھاپا گیا۔

یوسیفس یہ بھی لکھتا ہے کہ ان بائیس کتابوں کے سوا اور کتابیں جو ایسی قابلِ قدر نہیں خیال کی گئیں یونانی زبان میں ترجمہ کی گئی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جن کتابوں کو یہودی اپنی دینی کتابیں سمجھتے تھے اور جو ان کے پاس ہمیشہ عبرانی زبان میں محفوظ تھیں ان کے علاوہ دیگر کُتُب جو اگرچہ سیدنا مسیح کی ولادت سے بہت پہلے کی ہیں تو بھی ہر گز ہر گز یہودی کتبِ دین میں شمار نہیں ہوئیں۔ لہذا یہ کتابیں عہدِ عتیق میں شامل نہیں ہوسکتیں جہاں تک ہوسکتا تھا تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ملک مصر میں ۲۸۵ سے ۲۴۷ سال قبل از مسیح کے بیچ میں ٹولی ثانی فیلاڈیلفس کی خواہش کے مطابق تورات کا

[1] ہوسیع، یوایل، عموس، عبدیاہ، یوناہ، میکاہ، نحوم، حبقوق، صفنیاہ، حجی، ذکریا۔ ملاکی

عبرانی سے یونانی میں ترجمہ کیا گیا۔ بعض کے نزدیک اس ترجمہ کازمانہ ۲۵۰ سے ۲۰۰ سال قبل از مسیح تک زیادہ قرینِ قیاس ہے لیکن یہ امر چند ان قابلِ توجہ نہیں ہے ۔ عہدِ عتیق کی باقی کتب کا ترجمہ بعد میں ہوا لیکن وہ بھی سیدنا مسیح کی ولادت سے بہت عرصہ پہلے ہوا۔ یہ ستر کا نسخہ (یہ خیال کیا گیا ہے کہ اس ترجمہ کو ستر مترجموں نے کیا لہذا اس کو ستر کے نام سے نامزد کردیا) عہدِ عتیق کا قدیم ترین ترجمہ ہے۔ اب ہم اور ترجموں کا بیان کرینگے اوراس سے یہ بات ثابت ہوگی کہ جو عہدِ عتیق اب ہمارے پاس ہے یہ یقیناً وہی ہے جو حضرت محمد ﷺ کے ایام میں موجود تھا اوراس سے پہلے بھی موجودومروج تھا۔ اگراس قدیم زمانہ میں موجود نہ ہوتا تو جہلا بھی صاف سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا ترجمہ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔

۱۳۰ ء میں اکویلانے یونانی میں ترجمہ کیا۔ پھر ۲۱۸ء میں سمیکس نامی ایک سامری نے ترجمہ کیا۔ اطالوی یا لاطینی ترجمہ سنہ عیسوی کی دوسری صدی میں ہوا اور یہ اسی مذکورہ بالاستر (۷۰) نسخہ سے کیا گیا تھا ۔ جیروم نے ۴۰۵ء میں عبرانی سے عہدِ عتیق کا ترجمہ کیا۔

سریانی زبان میں ترجمہ بہت قدیم زمانہ میں شروع ہوا۔ ایڈیسا کے یعقوب نے کہا ہے کہ ایک ترجمہ قریباً مسیح کے زمانہ میں ابگر بادشاہ ایڈیسا کے لئے کیا گیا تھا۔ عہدِ عتیق کاسریانی ترجمہ پشطا پہلی دفعہ مذکور ہوا ہے۔ خیال کیا گیا ہے کہ اس کا مترجم ملیٹو تھا اور یہ ترجمہ دوسری صدی میں ہوا۔ بعض اس کو

تیسری صدی سے منسوب کرتے ہیں پھر ایک ترجمہ فلاکسینین کہلاتا ہے۔ یہ بھی سریانی زبان میں ہے جو پالیکارپ نے قریباً ۵۰۸ء میں کیا ہے۔ ۶۱۶ء میں ٹامس حرقلی نے اس ترجمہ کی نظر ثانی کی ۔ دیگر سب سریانی ترجمے حضرت محمد کے ایام سے پیشتر ہوئے اور یہ انہیں کے ایام میں ہوا۔ ہجرت سے پیشتر جب حضرت محمد کے پیرو مکہ سے بھاگ کراے بی سینیا میں پناہ گزیں ہوئے تو انہوں نے وہاں کے مسیحیوں کے پاس ایتھنی اوپین عہدِ عتیق وجدید کو پایا۔ ان ایام میں یہ ترجمہ اس قدر قدیمی خیال کیا جاتا تھا کہ خوداے بی سینیا کے مسیحی بھی یہ نہیں جانتے تھے کہ کب سے ہے کیونکہ یہ ترجمہ قریباً چوتھی صدی میں مذکورہ بالاستر کے نسخہ سے کیا گیا تھا۔

جب حضرت عمر نے ملکِ مصر کو فتح کیا تو اس نے اکثر لوگوں کو مسیحی پایا۔ انہوں نے اسی ستر والے ترجمے سے کم از کم تین مصری زبانوں میں عہدِ عتیق کا ترجمہ کیا تھا۔ یہ تینوں ترجمے بحیری۔ صعیدی اور بشموری کہلاتے ہیں۔ یہ غالباً تیسری یا چوتھی صدی میں کئے گئے تھے اگرچہ بعض کے نزدیک اس سے بھی پیشتر کے ہیں۔

قریباً ۴۱۱ء میں عہدِ عتیق کے بعض حصص کا ترجمہ سریانی زبان سے ارمنی میں کیا گیا۔ پھر ۴۳۶ء میں ایک اور ترجمہ شائع ہوا جو کہ یونانی سے ارمنی زبان میں کیا گیا تھا۔ پھر قریباً ایک سو سال بعد لیکن سنہ ہجری سے مدتوں پیشتر جارجین ترجمہ ارمنی زبان سے کیا گیا۔

اب اگر ہم یورپ کی طرف نظر کریں تو ہم دیکھینگے کہ گاتھ قوم کے بشپ الفیلاس نامی نے جس نے ۳۸۱ء یا ۳۸۳ء میں وفات پائی ۳۶۰ء میں اپنے لوگوں کے لئے گاتھک زبان میں بائبل کا ترجمہ تمام کیا۔

ستر(۷۰) والے یونانی ترجمہ اوراکویلاس کے ترجمہ کے سوا ان تراجم کے مترجمین زیادہ تر مسیحی ہی تھے۔ لیکن جب زیادہ تر یہودی بجا عبرانی غیر زبان بولنے لگے تو یہودیوں نے بھی عہدِ عتیق سے بہت سے حصہ کا عبرانی سے ارمنی زبان میں ترجمہ کیا۔ اونکیلاس نے ۱۵۰ء اور ۲۰۰ء کے درمیانی عرصہ میں تورات کا ترجمہ کیا۔ پھر قریباً ۳۲۲ء میں یونتن بن عزئیل نے صحفِ انبیاء کا ترجمہ کیا۔ علاوہ بریں یروشلیم والا ترجمہ موجود ہے جو سنہ ہجری سے پیشتر قریباً چھٹی صدی میں کیا گیا تھا۔

یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ قدیم الایام میں سامری لوگ یہودیوں کے سخت دشمن تھے۔ انہوں نے توراتِ موسوی کے سواعہد عتیق کی باقی کتب کو الہامی قبول کرنے سے انکار کیا۔ تورات کو بیشک انہوں نے قبول کیا اور اس کی بہت تعظیم کرتے تھے۔ ہم کو ٹھیک معلوم نہیں ہے کہ ان کو تورات کا عبرانی نسخہ کب ملا۔ بعض کا خیال ہے کہ قریباً ۶۰۶ سال قبل از مسیح جب یہودیوں کی ستر[1] سالہ اسیری کا آغاز ہوا۔ لیکن بعض یوں بھی خیال کرتے ہیں

[1] یہ اسیری ۵۳۶ سال قبل از مسیح تمام ہوئی ہے

کہ الیاشب سردار کاہن کو پوتا منسی سامریہ میں لایا۔ اس نے سنبلط[1] کی بیٹی سے شادی کی تھی اور چونکہ نحمیاہ نے اس کو یروشلیم سے خارج کردیا تھا اس لئے اس نے کوہِ کرازین پر ایک ہیکل بنائی تھی۔ یہ واقعہ قریباً ۴۰۹ سال قبل از مسیح کا ہے۔ اب تک ہمارے پاس وہ سامری تورات موجود ہے جو اصل عبرانی زبان میں مرقوم ہے اگرچہ اس کے حروف یہودیوں کے مروجہ حروف سے مختلف ہیں۔

جب ہم ان شہادتوں پر غور کرتے ہیں اور یہ دریافت کرتے ہیں کہ جو عہدِ عتیق زمانہ حال کے یہود و نصاریٰ میں رائج ہے کیا وہی حضرت محمد کے ایام میں موجود تھا یا نہیں؟ تو یہ سب اس جواب میں ہمزبان ہیں کہ "وہاں موجود تھا" ۔ اس میں شک نہیں کہ اختلافِ قرات موجود ہے جیسا قرآن میں اور دیگر قدیمی کتابوں میں بھی پایا جاتا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ ستر مترجموں والے یونانی ترجمہ میں یہودی شرائع کی کتب کے علاوہ چند غیر معتبر کتابیں بھی رائج ہیں۔ اگر عہدِ عتیق کے ان تمام مذکورہ بالا ترجموں کو دیکھیں تو ان خفیف اختلافات قرات کے سبب سے جوان میں پائے جاتے ہیں کسی تعلیم میں ذرہ برابر بھی تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا پس اگر ہمارے پاس اور شہادتیں نہ بھی ہوں تو مندرجہ بالا شہادتوں سے صاف ثابت ہے کہ عہدِ عتیق جواب ہمارے پاس

[1] نحمیاہ ۱۳: ۲۸

موجود ہے وہی ہے جو حضرت محمد کے ایام میں موجود تھا اور جس پر قرآن بار بار شہادت دیتا ہے۔

اب ہم عہدِ جدید کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہ دریافت کرتے ہیں کہ کیا یہ نسخہ جواب مسیحیوں میں مروج ہے وہی ہے جو حضرت محمد کے ایام میں موجود تھا؟ اس کے بارے میں تمام علماء اور تعلیم یافتہ اشخاص میں ذرا بھی شک نہیں ہے۔

حال کی تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ سیدنا مسیح کی حین حیات ہی میں اس کے حواریوں نے اس کے اقوال وافعال کو مختصر طور پر لکھ لیا تھا۔ ان میں سے بہت سے بیانات اب بھی پہچانے جاتے ہیں۔ خصوصاً آیات انجیل مرقس اگرچہ یہی تحریرات انجیل متی میں اور انجیل لوقا میں بھی شامل کی گئی ہیں ۔ بیشک اس کی صلیب اس کے دفن اور جی اٹھنے اور آسمان پر صعود فرمانے کا بیان صعودِ مبارک سے پیشتر نہیں لکھا جاسکتا تھا۔ اس کے جی اٹھنے کے بعد جنہوں اسے دیکھا[2] اور اس سے باتیں کیں چونکہ ان میں سے بہت سے زندہ تھے اس لئے لوگوں کو ان باتوں سے آگاہ کرنے کے لئے کتابیں لکھنے کی ضرورت نہ تھی جن کو وہ ہر روز زندہ گواہوں[3] سے سنتے تھے جن سے جرح کے سوالات ہوسکتے تھے۔ جو کتاب سے نہیں کئے جاسکتے۔ علاوہ برین محشور خداوند

[2] ۱ کرنتھیوں ۱۵: ۶

[3] اعمال الرسل ۱: ۲۱، ۲۲-

اپنے شاگردوں کو انجیل کی منادی کرنے کا حکم دیا تھا نہ کہ پہلے اسے لکھیں۔ جب ہم پولوس رسول کے مکتوبات کو پڑھتے ہیں تو ہم پر صاف عیاں ہوجاتا ہے کہ وہ انجیل کی منادی یا بشارت کیا تھی۔ اس مقام پر ہم کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ان مکتوبات میں سے سب سے پہلے (اول ، دوم تھسلنیکیوں) فقط ۲۲ یا ۲۳ سال سیدنا مسیح کے صعود فرمانے کے بعد لکھے گئے تھے اور ان مکتوبات اور پولوس رسول کے دیگر مکتوبات میں وہی تعلیمات مندرج ہیں جو کہ ہم مسیحی لوگ زمانہ حال میں مانتے ہیں۔

جب مسیحیوں کی پہلی پُشت کے لوگ اس دارِ ناپایدار سے گذرنے لگے تو روح القدس نے ہدایت کی کہ بعد کی پشتوں کے فائدے کے لئے اناجیل لکھی جائیں۔ چنانچہ انجیل مرقس ۷۰ء میں یروشلیم کی بربادی سے پیشتر ختم ہوئی اور قریباً ۶۵ء اور ۶۶ء کے درمیان روم میں لکھی گئی۔ مرقس نہ فقط رسولوں اور دوسرے اولین شاگردوں کا دوست وہمراہی تھا بلکہ ابتدائی کلیسیا میں وہ ہمیشہ پطرس کا مترجم ومفسر کہلاتا تھا۔ پس انجیل مرقس کی بنیاد زیادہ تر وہ بیانات ہیں جو اس نے خود پطرس کی زبانی سنے تھے۔ بیشک الہامِ الہیٰ نے ان بیانات کو بدل نہیں ڈالا بلکہ پطرس اور مرقس کی اس امر میں ہدایت کی کہ کیا تحریر کریں اور کیا چھوڑدیں اور پطرس کو ان باتوں کی یاددلائی جو سیدنا مسیح نے اسے فرمائی تھیں (یوحنا ۱۴ : ۲۶- ۱۵ : ۲۶)۔ اوراس کو غلطی کرنے سے محفوظ رکھا۔ انجیلِ متی بھی ۷۰ء سے پیشتر مرقوم ہوئی اور یوحنا ۹۰ء اور ۱۰۰ء کے درمیان جبکہ یوحنا بہت بوڑھا تھا لکھی گئی۔ پس اناجیل اربعہ میں سے دو کو تو رسولوں یعنی متی اور یوحنا نے تحریر کیا اور تیسری ایک رسول کے ایک برگزیدہ دوست نے غالباً رسول کے لکھوانے سے لکھی اور چوتھی کو لوقا پولوس رسول کے دوست نے لکھا۔ لوقا بیان کرتاہے کہ جو کچھ اس نے لکھا اس کے متعلق اس نے چشم دید گواہوں سے نہایت احتیاط ہوشیاری سے تحقیقات کی (لوقا ۱ : ۳تا ۴)۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ جو کچھ اس کی انجیل کے پہلے دو بابوں میں مندرج ہے وہ حضرت مریم طاہرہ کے منہ کے الفاظ ہیں۔

شاید کوئی یہ کہے کہ یہ تو الہامی کلام نہیں ٹھہرتا۔ بیشک یہ اس قسم کا الہام نہیں ہے جیسا کہ بعض مسلمانوں کا وہم ہے جو قرات کے متعلق اس قصہ کو سچ مانتے ہیں کہ خلقِ عالم سے ہزارہا سال پیشتر قرآن لوحِ محفوظ پر لکھا گیا اورشبِ قدر میں نچلے آسمان پر[1] نازل ہوا اور پھر وہاں سے حسب موقع حضرت جبرائیل نے لاکر ایک آیت کرکے حضرت محمد کو سکھایا۔ اس قسم کا الہام ہم مسیحیوں کے نزدیک ناپسندیدہ ہے اور قرآن کا ایسا الہام ہرگز ثابت نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ ینابیع الاسلام میں اس امر کی تصریح کی گئی ہے اصحاب فہم ودانش خوب سمجھ سکتے ہیں کہ اگر ہم بفرضِ محال ایسا خیال کریں بھی کہ کوئی مقدس کتاب اس طرح سے آسمان پر تصنیف ہوئی اور پھر بنی آدم کے لئے بھیجی گئی

---

[1] نزولِ قرآن کے متعلق مختلف خیالات پر کشف الظنون جلد دوم صفحہ ۳۴۰ مطبوعہ قسطنطنیہ ۱۳۱۰ ہجری ملاحظہ کیجئے۔

تو ایسا ہونے کا ثبوت بہم پہنچانا بالکل ناممکن ہوگا۔ لیکن مسیحی لوگ الہام کے بارے میں یوں مانتے ہیں کہ اللہ جل شانہ نے بنی آدم کی ہدایت کے لئے اپنا الہام تحریر کروانے میں نہ فقط انبیاء کے ہاتھ بلکہ ان کے ذہن وضمیر اور حافظہ وعقل اور روح کو بھی استعمال کیا۔ پس پیغام خدا کا تھا اور الفاظ لکھنے والوں کے۔دیکھو یوحنا ۱۶ : ۱۳۔

اب ہمیں ایک مشکل کو دور کرنا ہے جو کہ اکثر اوقات اکثر حق جو برادرانِ اہل اسلام کی راہ میں حائل ہوجاتی ہے ۔ بعض کہتے ہیں کہ جو انجیل اب مسیحیوں کے پاس ہے وہی نہیں جو حضرت عیسیٰ پر نازل ہوئی کیونکہ اب تو چار جدا جدا اناجیل ہیں کہ ایک انجیل اور وہ بھی حضرت عیسیٰ کے آسمان پر صعود فرمانے کے بہت عرصہ بعد لکھی گئی تھیں ۔ اب اس کا جواب دینا کچھ مشکل نہیں ہے کیونکہ اگر مسیح کے صعود کے بعد لکھا جانا انجیلی صداقت کے خلاف ہے تو قرآن کا کیا حال ہوگا؟ قرآن بھی تو جیسا مشکواۃ المصابیح[1] اور دیگر مستند کتبِ اسلامیہ میں مرقوم ہے حضرت محمد کی وفات کے بعد جمع کیا گیا تھا۔ لیکن یہ بات سمجھنے کے لائق ہے کہ فی الحقیقت ایک انجیل موجود ہے کیونکہ لفظِ انجیل اگرچہ اب ایک کتاب کے نام کے طورپر استعمال کیا جاتا ہے اوراس کے معانی کو اہل اسلام اکثر بھول جاتے ہیں تو بھی اس کا ترجمہ ومطلب خوشخبری ہے۔ لفظ انجیل یونانی لفظ انگلیون کے عربی صورت ہے۔ انگلیون کا ترجمہ البشارۃ ہے۔ یہ بشارۃ ۔ یہ الہیٰ محبت کا پیغام اور سیدنا مسیح کے وسیلہ سے راہِ نجات ایک ہی ہے اگرچہ اس کا بیان مختلف طورپر کیا گیا ہے تاکہ زیادہ لوگوں کے دلوں میں گھر کرے اور بجایِ خود واحد اس کے حق میں چار معتبر اصحاب کی شہادت ہو۔ پس ہم کہتے ہیں کہ انجیل ایک ہی ہے۔ اگر یونانی زبان کے اصلی نسخہ کو دیکھیں تواس کے نام ہی سے یہ بات صاف عیاں ہوجاتی ہے کیونکہ یونانی اصل میں لکھا ہے" انجیل حسبِ تحریر مقدس متی۔ انجیل حسب تحریر مقدس مرقس" وغیرہ فقط اختصار کے خیال سے" انجیل متی" وغیرہ کے القاب استعمال کئے جاتے ہیں۔ چاروں انجیل نویسوں میں سے ہرایک نے روح القدس کی ہدایت کے مطابق اپنے طور پر انجیل کو قلمبند کیا لیکن چاروں کا پیغام بالکل ایک ہی تھا اعمال الرسل سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیدنا مسیح کے صعود مسعود کے بعد فی الفور مسیحیوں نے ملک بہ ملک انجیل کی منادی شروع کردی لیکن سب سے پہلے سیدنا مسیح نے خود بشارت دی (مرقس ۱ : ۱۵-۱۳ : ۱۰- لوقا ۲۰ : ۱) ۔ پس صاف ظاہر ہے کہ پہلے انجیل مسیح کو دی گئی کیونکہ اس نے خودکہا کہ میرا پیغام خدا کی طرف سے ہے اور فرمایا" جوکچھ میں کہتا ہوں جس طرح باپ نے مجھ سے فرمایا ہے اسی طرح کہتا ہوں "(یوحنا ۱۲ : ۵۰)۔

عہدِ جدید کی کتب مشتملہ کے بارے میں علما خوب جانتے ہیں کہ وہ نہایت احتیاط اور تحقیقات کے ساتھ بتدریج مقبول ہوئیں اوراس کا سبب یہی

---

[1] مشکواۃ المصابیح صفحہ ۱۸۵ وغیرہ۔

تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی کتاب جو غیر الہامی ہو اس مجموعہ میں شامل کردی جائے ۔ اس تحقیقات میں بہت عرصہ لگا کیونکہ بعض خطوط خاص خاص لوگوں کے نام پر شخصی تھے۔ (۱ ، ۲ تمطاؤس ، ططس ، فلیمون۔ ا، ۲ یوحنا اور باقی جدا جدا کلیسیاؤں کی طرف لکھے گئے تھے لیکن قدیمی مسیحیوں کی تحریرات سے جواب تک بحفاظت موجود ہیں ثابت ہوتاہے کہ اناجیل اربعہ ۷۰ء اور ۱۳۰ء کے درمیانی عرصہ میں خوب معروف ومقبول ہوچکی تھیں۔ ایک نا تمام کتاب جو قریباً ۱۷۰ء کی ہے اس میں عہدِ جدید کی کتب مشتملہ کی فہرست کا ایک حصہ مندرج ہے۔ اگرچہ یہ کتاب دریدہ ہے تو بھی اس میں یعقوب کے خط اور پطرس کے دوسرے خط اور عبرانیوں کے خط کے سوا عہد جدید کی تمام کتابیں مذکور ہیں اوراس سے ان کی ہستی پر بین دلیل ملتی ہے۔ لیکن اس پوری فہرست میں ضرور یہ خطوط بھی مندرج ہونگے کیونکہ تمام دیگر مقامات میں دوسری صدی ہی میں سب مقبول تھے صرف ۲ پطرس شاید مستثنیٰ تھا۔ اگر اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ اس زمانہ میں کتابیں بہت بیش قیمت تھی اور مسیحی زیادہ تر تنگ ودست وتنگ حال تھے (۱ کرنتھیوں ۱ : ۲۶ تا ۲۷) اور عہدِ جدید کی تمام کتابیں اگریونانی خط اور حروف میں بڑے بڑے طوماروں میں لکھی جائیں تو نہ فقط ایک کتاب بلکہ ایک کتب خانہ بن جاتا۔ ہمیں تعجب ہے کہ قریباً یہ سب کتابیں مختلف ممالک میں اس قدیم زمانہ میں بھی رائج تھیں۔ ۳۶۳ء کی لاڈیسین کونسل میں عبرانی عہدِ عتیق کی ۲۲ کتابیں مذکور ہیں اور عہدِ جدید کی تمام کتابیں مکاشفاتِ یوحنا کے سوا مندرج ہیں۔ پس اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں مکاشفات یوحنا کے بارے میں کچھ مشکوک موجود تھے۔ بعض کلیسیاؤں نے اسے قبول کرلیا تھا اور بعض نے اگرچہ بعد میں قبول کیا ابھی اس کے بارے میں فیصلہ نہیں کیا تھا۔ کارتھیج میں ۳۹۷ء میں ایک کونسل منعقد ہوئی اور یہ کونسل ہمارے موجودہ عہدِجدید کی تمام کتابوں کی فہرست دیتی ہے اور یہ کہتی ہے" ہم نے اپنے باپ دادا سے پایاہے کہ یہ کتابیں کلیسیا میں پڑھی جائیں"۔

کونسلوں کی ان فہرستوں کے علاوہ قدیم زمانہ کے بعض مسیحی مصنفین نے بھی ان کتابوں کی فہرستیں لکھی ہیں جن کو انہوں نے بغور پڑھا ہے اور تسلیم کیا کہ وہ فی الحقیقت مسیح کے رسولوں اور دیگر قدیمی شاگردوں کی تصانیف ہیں۔ مثلاً اوریجن جس نے ۲۵۳ء میں وفات پائی ہمارے عہدِجدید کی تمام کتابوں کا ذکر کرتا ہے۔ اتھینسیس جس نے ۳۱۵ء میں اس دارنا پایدار کو چھوڑا وہ بھی ایسا ہی لکھتاہے ۔ یوسیبیس قریباً اسی زمانہ میں ان سب کتابوں کا ذکر کرتا ہے اگرچہ وہ یہ بھی بتلاتا ہے کہ بعض لوگ ابھی شبہ میں تھے کہ آیا یعقوب اور یہوداہ کے خط اور پطرس کا دوسرا خط اور یوحنا کا دوسرا اور تیسرا خط اورمکاشفات اصلی ہیں یا نہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں زیادہ غور وفکر اور تحقیقات سے کلیسیا اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ یہ تمام کتب عہدِ جدید میں شامل ہیں۔

پس سنہ عیسوی کے پہلے چار سو سال میں فلسطین - سیریا - کپرس ، ایشیا کوچک، اسکندریہ ، شمالی ، عثمانی ، افریقہ اور اٹلی سے عہدِ جدید کی تمام کتب کی ہستی اور صحت ودرستی کی شہادت ملتی ہے۔

لہذا ثابت ہوتا ہے کہ ہمارا عہدِ جدید جیسا کہ موجودہ زمانہ میں مسیحیوں کے درمیان رائج ہے ویسا ہی حضرت محمد کے ایام میں موجود تھا اور عرب سیریا۔ مصر، حبش اور دیگر ممالک کے مسیحیوں کے پاس تھا اوران ممالک کے باشندوں سے آنحضرت کوسابقہ پڑا تھا۔

اب تک ہم نے یہ ثابت کیا ہے کہ تمام کتبِ عہد عتیق وجدید حضرت محمد کے زمانہ میں موجود تھیں لیکن تاحال ہم نے یہ نہیں دکھایا کہ ہم نے کیونکر جانا کہ عہدِ عتیق وجدید کی کتابیں جواس زمانہ میں اس زمانہ کی بائبل کی مشتملہ کتب کے ناموں سے نامزد تھیں فی الحقیقت وہی ہیں جواب ہمارے پاس عہدِ عتیق وجدید یا بائبل کی صورت میں موجود ہیں - کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ قدیمی کتابیں نیست ہوگئیں اوران کی جگہ اور جعلی کتابیں تصنیف ہوکر انہیں قدیم ناموں سے شائع ہوئیں ؟ اگر کوئی مسلمان قرآنی سورتوں کے بارے میں تھوڑی سی دیر کے لئے اس سوال پر غور کرے کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ سورہ بقرہ جواب قرآن میں موجود ہے وہی سورہ بقرہ ہے جو حضرت عمر کے زمانہ میں تھی ؟ تو اس پر صاف منکشف ہوجائیگا کہ مسیحیوں کی کتب مقدسہ کے بارے میں ان سے اس قسم کا سوال کرنا بالکل لغو ولایعنی ہے۔ لیکن پھر بھی ہر طرح کے شک وشبہ کو رفع ودفع کرنے کے لئے ہم اس سوال کا جواب ذیل میں عرض کرتے ہیں۔

موجودہ کتب بائبل کے وہی ہونے کا جو کہ حضرت محمد کے ایام میں تھیں ایک ثبوت یہ ہے کہ ہمارے پاس عہدِ عتیق وجدید کے کئی نسخے ایسے موجود ہیں جو فی الحقیقت حضرت محمد کے ایام میں موجود تھے - چنانچہ عہدِ جدید کا اصلی یونانی مسودہ اور عہدِ عتیق کے یونانی ترجمہ کا مسودہ جن کا ذکر آگے آئیگا مسیحیوں کے پاس موجود ہیں۔

عہدِ عتیق کااصل قدیم ترین مسودہ جو عبرانی زبان میں موجود ہے وہ ابھی چار پانچ سال کا عرصہ ہوا کہ ایک تختہ کاغذ پر مصر میں برآمد ہوا ہے۔اس پر دس احکام اور یہودی عقیدہ وغیرہ مندرج ہیں (خروج ۲۰: ۲تا ۷ اور استثنا ۶: ۴تا ۹) یہ ۲۲۰ء اور ۲۵۰ء کے درمیان کی تحریر ہے۔ یہ سنہ ہجری سے بہت پیشتر کا زمانہ ہے۔

لیکن قدیم ترین اور بڑے سے بڑا مسودہ جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہے وہ اوری اینٹل نمبر ۴۴۴۵ کہلاتا ہے۔ یہ مسودہ برطانیہ کے عجائب خانہ میں محفوظ ہے اور غالباً ۸۲۰ء اور ۸۵۰ء کے درمیانی عرصہ کی تحریر ہے۔ پھر اس کے بعد کا قدیم ترین نسخہ سینٹ پیٹرزبرگ والا مسودہ ہے جس پر ۹۱۶ء مرقوم ہے۔ یہ مسودہ بحفاظت تمام سینٹ پیٹرزبرگ میں موجود ہے - لیکن یہ مسودہ ان قدیم ترین مسودوں کی نقل ہیں جن کی ہستی پر شہادت دیتے

ہیں۔ چنانچہ ان میں سے دو سیفر ھیلیلی اور سیفر میوگاہ" ہیں۔ یہودی مورخ زکوت نے قریباً ۱۵۰۰ء میں لکھا ہے کہ سیفر ھیلیلی قریباً ۵۹۷ء کی تحریر ہے اوراس نے خوداس کے دو حصے دیکھے ہیں جن میں انبیاءِ سلف اور انبیاءِ مابعد کی کتابیں یعنی یشوع، قضاۃ ، اول ودوم سیموئیل، اول ودوم سلاطین ، یسیعاہ، یرمیاہ، حزقی ایل ، ہوسیع ، یوایل، عموس، عبدیاہ، یوناہ، میکاہ، نحوم ، حبقوق ، صفنیاہ، حجی ،ذکریاہ اور ملاکی مندرج تھیں۔ سیفر میوگا بھی کم از کم ایسی ہی قدیمی تھی۔ ان دونوں مسودوں میں سے کم از کم ایک ضرور حضرت محمد کے ایام میں موجود تھا۔ ان کی یہودی تفاسیر سے صاف عیاں ہے کہ ان میں وہی کتابیں شامل تھیں جو کہ اب عبرانی بائبل میں شامل ہیں۔ علاوہ بریں بعد کے عبرانی مسودہ سے جو کہ قدیمی مسودوں کی نقل ہیں کثیر التعداد ہیں۔

اگر کوئی پوچھے کہ قدیمی مسودے کہاں گئے تو اس کا جواب جو کہ یہودیوں کی طرف سے بھی دیا جاتا ہے یہ ہے کہ جب عبادت خانہ میں استعمال کے سبب سے بہت کہنہ اور بوسیدہ ہوجاتے تھے تو حسب دستور ذخیرہ خانہ میں رکھ دیئے جاتے تھے۔ پھر جب کوئی بڑا بزرگ ومشہور ربی وفات پاتا تھا تو ایک کہنہ مسودہ اس کے ساتھ دفن کردیا جاتا تھا۔ بعض اوقات کہنہ مسودوں کو نہایت احتیاط کے ساتھ نقل کرکے غایت درجہ کی تعظیم کے ساتھ جلادیتے تھے تاکہ ان کی کسی طرح سے بے حرمتی وبے عزتی نہ ہونے پائے۔

اب اگرہم عہدِ عتیق کے سپٹواجنٹ یونانی ترجمہ کا خیال کریں جس کی ہستی عبرانی اصل کے وجود پر دلالت کرتی ہے تو فی الحقیقت ہمارے پاس بہت سے مسودے ہیں جو سنہ ہجری سے بہت عرصہ پیشتر لکھے گئے تھے اور حضرت محمد کے زمانہ میں ویسے ہی موجود تھے جیسے کہ اب ہیں۔ ہم ان میں سے خاص خاص کا ذیل میں ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ السفر السینائی جو کہ چوتھی صدی میں یا پانچویں صدی کے آغاز میں لکھا گیا۔

۲۔ الوطیقانی۔ جو غالباً چوتھی صدی کے پہلے حصہ میں تحریر کیا گیا۔

۳۔ الاسکندری جو پانچویں صدی کے وسط یاآخر میں مرقوم ہوا

۴۔ القطونی جو پانچویں یا چھٹی صدی میں قلمبند ہوا۔

۵۔ الامبروسیائی جو پانچویں صدی کے نصف اول میں تحریر میں آیا۔

یونانی عہدِ عتیق کے یہ تمام مسودے فی الحقیقت حضرت محمد کے ایام میں موجود تھے۔ اگر کوئی صاحب علم قدیم واصلی توریت وزبور اور صحفِ انبیاء کو جن کا قرآن میں ذکر آیا ہے دیکھنا چاہے تو اسے چاہیے کہ ان کُتب خانوں کو ملاحظہ کرے جن میں یہ مسودے محفوظ ہیں۔ عہدِ عتیق کے یونانی نسخے جو تمام مسیحی علما کے پاس موجود ہیں وہ بالکل مذکورہ بالا مسودوں کے مطابق چھاپے گئے ہیں۔جب ہم عبرانی مسودوں کا ان یونانی مسودوں سے مقابلہ کرتےہیں تو ہر ایک تعلیم میں ان ہی باہمی موافقت ومطابقت پاتےہیں۔ فقط

چند مقامات پر نہایت خفیف سا اختلافِ قرات پایا جاتا ہے اور بعض مقامات پر یونانی مترجموں نے بعض مشکل الفاظ کا ترجمہ غلط کیا ہے۔ سیپٹواجنٹ ترجمہ میں اورموجودہ عبرانی اصل میں بھی پیدائش کے پانچویں اور گیارھویں باب کے مندرجہ بزرگوں کی عمروں کے بارے میں باہمی اختلاف ہے۔ لیکن ان اختلافات قرات سے کسی دین کے ایمان واعمال میں کچھ فرق نہیں آتا۔

یونانی عہدِ جدید کے بھی ہمارے پاس بہت قدیمی مسودے موجود ہیں اور یہ کاغذ پر نہیں بلکہ چمڑے پر مرقوم ہیں۔ لہذا شیخ رحمت اللہ کا یہ کہنا کہ "[1] ان بقاء القرطاس والحروف الیٰ الف واربع مایة اوازید مستبعد عادة"(یعنی کاغذ اور حروف کا چودہ سو سال یا اس سے زیادہ تک باقی رہنا عجیب ہے ، بالکل بیجا ہے۔ علما خوب جانتے ہیں کہ مصر میں کاغذوں پر ایسی ایسی تحریرات برآمد ہوئی ہیں جو اٹھارہ سو سال سے بھی زیادہ کی ہیں۔ بہت سے مسودے ایسے بھی ہیں جن میں عہدِ عتیق کے یونانی ترجمہ کے ساتھ عہدِ جدید کی یونانی اصل بھی شامل ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک مذکورہ بالاالسفر السینائی ہے اور سینٹ پیٹرز برگ کے شاہی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ دوم الواطیقانی روم کے بڑے پادری کے کُتُب خانہ میں موجود ہے۔ سوم الاسلندری شہر لندن کے عجائب خانہ میں موجود ہے۔ ان مسودوں کے سنہ تحریر ہم لکھ چکے ہیں۔ چہارم ۱۹۰۷ء میں ملکِ مصر میں اخمیم کے مقابل سوھگ کے قریب ایک خانقاہ سے ایک یونانی مسودہ کے

[1] اظہار الحق جلد اول صفحہ ۲۴۵

چار حصے برآمد ہوئے ہیں جو غالباً چوتھی صدی سے ایک یونانی مسودہ کے چار حصے برآمد ہوئے ہیں جو غالباً چوتھی صدی کی تحریر ہیں اوریقیناً چھٹی صدی سے بعد کے نہیں ہیں۔ ایک حصہ میں کتاب استثنا اور یشوع کی کتاب مندرج ہیں اور دوسرے حصہ میں زبور مرقوم ہے۔ تیسرے حصہ میں اناجیل اربعہ ہیں اور چوتھے حصہ میں پولوس رسول کے خطوط کے حصص مندرج ہیں۔ پنجم السفر البیزائی جو کیمبرج یونیورسٹی میں محفوظ ہے قریباً چھٹی صدی کے شروع کی تحریر ہے۔ ششم السفر الافرائمی جو پانچویں صدی کے پہلے حصہ کی تحریر ہے اب پیرس کے قومی کتب خانہ میں موجود ہے۔

ان بڑے بڑے مسودے کے علاوہ ہمارے کتب خانوں میں چھوٹے چھوٹے مسودے بھی موجود ہیں جن میں عہدِ جدید کے حصے جدا جدا یونانی زبانی میں مندرج ہیں۔ ان میں سے قدیم ترین ایک تختہ کاغذ ہے جو اوروں کے ساتھ ملکِ مصر میں موضع بھنسیة کے قریب کھنڈروں سے برآمد ہوا ہے اور اسی واسطے بھنسیة کے نام سے منسوب ہے۔ بھنسیة مصر کے دارالسلطنت قاہرہ سے جنوب کی طرف قریباً ایک سو بیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہ ۲۰۰ء اور ۳۰۰ء کے درمیانی عرصہ کی تحریر ہے۔ یعنی حضرت محمد کی ولادت سے ۳۷۰ اور ۲۷۰ سال پیشتر کے درمیان کی۔ اس میں انجیل یوحنا کا پہلا اور بیسواں باب مندرج ہیں۔ ایسے مسودے جو حال ہی میں برآمد ہوئے ہیں خاص طور سے قابلِ قدر ہیں کیونکہ وہ سنہ ہجری سے صدہا سال پیشتر سے اس ریگستان میں مدفون تھے جو بعد

میں اسلامی ممالک میں شامل ہو گیا اورحال میں کھودے جانے تک وہیں مدفون رہے اور اب متعصب سے متعصب آدمی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ نزولِ قرآن کے بعد کی جعلسازی میں یا حضرت محمد کے ایام میں یا آنحضرت کے بعد مسیحیوں نے ان کو محرف بنادیا۔

یونانی زبان میں عہدِ جدید کے پورے یا مختلف حصوں کے ۳۸۹۹ مسودے ہمارے پاس موجود ہیں۔ ان سب کی نہایت غور وفکر کے ساتھ تحقیق کی گئی ہے اوران کی فہرست تیار کی گئی ہے تاکہ جو لوگ ان کو دیکھنا اور پڑھنا چاہیں ان کو معلوم ہوجائے کہ وہ کہاں ہیں اور قریباً ۲۰۰۰ سے ۳۰۰۰ تک اور مسودے ہیں جن کی فہرست اب تک تیار نہیں ہوئی۔

اب تک ہم نے عہدِ جدید کے ان مسودوں کا ذکر کیا ہے جو اصل یونانی زبان میں ہیں لیکن اس مقام پر یہ بتلانا بیجا نہ ہوگا کہ عہدِ جدید کے اور زبانوں میں ترجموں کے مسودے بھی حضرت محمد کی ولادت سے پیشتر ہی سے موجود ہیں۔ مثلاً سریانی ترجمہ پشطا کے کم از کم دس مسودے ایسے موجود ہیں جو پانچویں صدی میں اور بھی قدیم ترین مسودوں سے نقل کرکے تیار کئے گئے اور تیس اور مسودے چھٹی صدی کے ہیں۔

عہدِ عتیق کے متعلق لکھتے ہوئے ہم نے بہت سے ایسے ترجموں کا ذکر کیا ہے جو نہایت قدیم زبانوں میں کئے گئے جن کو زمانہ حال کے لوگوں میں سے کوئی بھی مادری زبان کے طور پر نہیں بولتا۔ عہدِ جدید کے مکمل یا ناتمام کثیر التعداد اور ترجمے موجود ہیں۔ ان میں سے ہم چند ایک مشہور ترین کا ذکر کرینگے۔ جتنے ترجموں کا ہم نے ذکر کیا ہے ان میں سے فقط ایک حضرت محمد کے ایام میں کیا گیا تھا۔ باقی سب کے سب آنحضرت کی ولادت سے پیشتر کے ہیں۔ جو آنحضرت کے ایام میں کیا گیا وہ بھی سنہ ہجری سے پیشتر کا ہے۔

ہمارے پاس بہت سے سریانی ترجمے ہیں خاص کر پشطا جو دوسری یا تیسری صدی کا ہے۔ فلو کسینین سریانی ترجمہ قریباً ۵۰۸ء کا ہے اوراس کی نظر ثانی ۶۱۶ء میں ٹامس حرقلی نے کی۔ لیکن ان کے علاوہ اور سریانی ترجمے بھی ہیں۔ ان میں سے دو کے مسودے موجود ہیں جو کیوری ٹونین اور سینائی سریانی کہلاتے ہیں۔ عہدِ جدید کے ایک ترجمہ کی نہایت قدیم ہستی پر اس حقیقت سے دلیل ملتی ہے کہ ٹیٹین جو قریباً ۱۱۰ء میں پیدا ہوا اس نے اناجیل اربعہ کی باہمی موافقت پر ایک کتاب لکھی ہے۔ یہ کتاب نہایت خفیف سی صوری تبدیلی کے ساتھ لاطینی اور ارمنی زبان میں موجود ہے۔ اس کے سریانی ترجمہ سے ابن الطیب نے عربی میں ترجمہ کیا۔ ابن الطیب نے ۱۰۴۳ء میں وفات پائی۔ نہایت ہی توجہ طلب اور قابلِ قدر عہدِ جدید کے ترجمے کے وہ حصے ہیں جو حال ہی میں برآمد ہوئے ہیں کیونکہ یہ ترجمہ یونانی زبان سے سریانی بول چال کی زبان میں کیا گیا تھا جو سیدنا مسیح کی مادری زبان تھی۔ یہ ترجمہ اگر پیشتر نہیں تو غالباً چوتھی صدی میں کیا گیا تھا۔ اس کا جو مسودہ تاحال

موجود ہے سفیر کلیما کوس کہلاتا ہے یہ چھٹی صدی کی تحریر ہے اور اس میں اناجیل اربعہ کے حصص۔ اعمال الرسل اور پولوس کے خطوط مندرج ہیں۔

لاطینی زبان میں عہدِ جدید کے بہت سے نہایت قدیم جزوی ترجمے موجود تھے۔ ان کا ذکر آگسٹین اور جیروم کی تصانیف میں پایا جاتا ہے چنانچہ جیروم لکھتاہے کہ یہ ترجمے بعض مقامات پر صحیح نہ تھے اوراس کاسبب یہ تھا کہ جن لوگوں نے اپنے استعمال کے لئے یہ ترجمے کئے تھے ان کو علم نہ تھا۔ ان سب میں بہتر قدیم لاطینی میں ترجمہ تھا جو دوسری صدی میں کیا گیا تھا۔ لاطینی زبان میں زیادہ صحیح ترجمہ کی ضرورت کے سبب سے ۳۸۳ء اور ۳۸۵ء کے درمیان خود جیروم نے عہدِ جدید کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔ اس ترجمہ کے کم از کم آٹھ ہزار مسودے ہمارے پاس موجود ہیں۔ یہ لاطینی میں الترجمۃ العامیۃ کہلاتا ہے۔ ان مذکورہ بالا مسودوں میں سے بعض چوتھی پانچویں اور چھٹی صدی کے ہیں۔ پس صاف ثابت ہوا ہے کہ نہ فقط سنہ ہجری سے بہت عرصہ پیشتر بائبل کا لاطینی میں ترجمہ ہوچکا تھا بلکہ اس ترجمہ کے بہت سے مسودے جو کہ اب ہمارے پاس موجود ہیں حضرت محمد کے ایام میں بہت قدیم اور پرانے تھے۔

عہد عتیق کے بیان میں ہم کہہ چکے ہیں کہ نہایت قدیم زمانہ میں قدیم مصری بولی کے متن مختلف محاوروں میں استعمال کیا گیا تھا۔ عہدِ جدید کے بارے میں بھی سچائی کے ساتھ یہی کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ البحیری ترجمہ تیسری اور چوتھی صدی کے درمیان میں کیا گیا اور الصعیدی بھی قریباً اسی زمانہ میں ہوا۔ البشموری تین محاروں میں منقسم تھی۔ ان میں سے ایک الفیومی اور دوسرا نشیبی الصعیدی اور تیسرا الاخیمی تھا۔ ان زبانوں میں عہدِ جدید کا جزوی یا کلی ترجمہ کیا گیا تھا۔ الصعیدی ترجمہ غالباً قدیم ترین ہے۔ عہد جدید کے ترجمہ کا جو مسودہ قدیم مصری میں ہے وہ چوتھی اور پانچویں صدی کا ہے۔

گاتھک ترجمہ قریباً ۳۶۰ء میں ہوا۔ جس مسودہ میں یہ ترجمہ محفوظ ہے وہ پانچویں یا چھٹی صدی کی تحریر ہے۔

مختلف زبانوں میں بائبل کے ترجموں کے ان متعدد مسودوں کے علاوہ ہمارے پاس اور طرح کی نہایت قابلِ قدر شہادت بھی موجود ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے موجودہ عہد عتیق اور عہد جدید وہی ہیں جو حضرت محمد کے ایام میں اوران سے بہت عرصہ پیشتر موجود تھے۔ یہ شہادت ان اقتباسات میں پائی جاتی ہے جو قدیم زمانہ کے مسیحی مصنفین نے بائبل سے کئے ہیں ۔ ان کی تصانیف میں سے بعض یونانی بعض لاطینی ، کچھ سریانی اور کچھ قدیم مصری اورارمنی زبان میں ہیں۔ ان مصنفین کی تصانیف میں بائبل کی بہت سی آیات ٹھیک اسی طرح سے پائی جاتی ہیں جس طرح مصنفین اسلام کی عربی ، فارسی ، اردو اور ترکی تصانیف کا آیاتِ قرآنی۔ اگر قرآن کے تمام نسخے مفقود ہوجائیں تو بہت سا یا سب کا سب ان اقتباسات کو جمع کرنے سے جمع ہوسکتا ہے۔ اسی طرح سے اگر یونانی عہدِ جدید کے سب نسخے حضرت کے ایام سے بہت عرصہ پیشتر ضائع ہوجاتے تو پہلی چند صدیوں کے مسیحی مصنفین کی

تصانیف کے مندرجہ اقتباسات کو جمع کرنے سے پھر جمع ہوسکتا تھا۔ چند آیات کا غیر مسیحیوں نے بھی اقتباس کیا ہے۔ مثلاً سیلس پورفری اور جولین ملحد نے تمام مسیحی مصنفین صاف وصریح اقتباسات کے علاوہ سیدنا مسیح کی زندگی کے واقعات کا نہایت صحیح علم دکھاتے ہیں۔ وہ اس کے مصلوب ہونے ، جی اٹھنے اور آسمان پر صعود فرمانے کے واقعات سے جواناجیل اربعہ میں مفصل ومشرح طور پر مرقوم ہیں خوب آگاہ ہیں۔ یہ ایک اورہی طرح کی شہادت ہے اور جن شہادتوں کو ہم پہلے پیش کرچکے ہیں اس سے ان کی تائید ہوتی ہے۔

علاوہ برین شہر روم کے نیچے سرد ابوں اور دوسری، تیسری اور چوتھی صدی کے بہت سے مسیحیوں کی قبریں ملی ہیں۔ان قبروں پر کی تصاویر وتحریرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان ایام میں مسیحی مومنین انہیں تعلیمات کو مانتے اور عمل میں لاتے تھے جو ہماری حال کی موجودہ بائبل میں مندرج ہیں۔

پس اب صاف ظاہر ہے اور کسی طرح کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ حضرت محمد کے ایام سے بہت عرصہ پیشتر سے یہود ونصاریٰ کے پاس وہ دینی کتابیں موجود تھیں جن کو وہ الہام الہیٰ مانتے تھے اور یہ کتابیں وہی ہیں جو زمانہ حال میں عہدِ عتیق اور عہدِ جدید میں پائی جاتی اور رائج ہیں اور جن کا عربی ، فارسی ، ترکی ، اردو اور قریباً ۴۰۰ دوسری زبانوں میں ترجمہ کیا جاچکاہے۔

لہذا جب قرآن ہم کو یہ بتلاتاہے کہ خدا نے حضرت محمد کواالکتاب کی تعلیم کے بارے میں اھلِ الکتاب سے پوچھنے کی ہدایت کی تو الکتاب کا مفہوم ہماری حال کی موجودہ بائبل کے سوا کوئی اور کتاب نہیں ہے۔ کیونکہ عہدِ عتیق وجدید اس زمانہ میں حال کی طرح یہود ونصاریٰ کی کتبِ مقدسہ تھیں۔ جیسا کہ ہم پہلے باب میں دیکھ چکے ہیں قرآن کتب مقدسہ کے بڑے بڑے حصوں یعنی تورات وزبور اور صحف انبیاء واناجیل کے نام لیتا ہے اور فی الحقیقت ان سے بہت سی عبارات نقل کرتاہے موجودہ بائبل میں موجود ہیں۔ قرآن بائبل کو بڑے بڑے عالیشان القاب کلامہ اللہ کتاب اللہ ، فرقان اور ذکر سے ملقب کرتا ہے ۔ جولوگ بائبل کی تعظیم نہیں کرتے ان کو قرآن عالمِ آخرت میں نہایت ہولناک عذاب کی دھمکی دیتا ہے (دیکھو سورہ مومن آیت ۷۲ویں) قرآن اپنے نزول کا خاص مقصد صاف طور سے بائبل کی تصدیق وحفاظت بیان کرتا ہے (دیکھو سورہ آل عمران دوسری آیت) اورمسلمانوں کو حکم ہے کہ جیسا قرآن پر ایمان لاتے ہیں ویسا ہی راسخ ایمان بائبل پر بھی لائیں(دیکھو سورہ بقرہ ۱۳۰ ویں آیت اور سورہ آل عمران ۷۸ویں آیت)۔

پس چونکہ یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ عہدِ عتیق (جدید جو اس وقت یہود ونصاریٰ میں رائج ہیں وہی ہیں جو حضرت محمد کے ایام میں ان کے پاس موجود تھے اور جن کے حق میں قرآن شہادت دیتا ہے لہذا تمام سچے مسلمانوں پر فرض وواجب ہے کہ خدایِ رحیم کے حضور میں نہایت سرگرمی اوراخلاص کے ساتھ دعا کرتے ہوئے ان کو پڑھیں تا کہ وہ بذات پاک کتاب اللہ کے سمجھنے میں

ان کی مدد کرے اوروہ کتاب[1] المنیر ان کے لئے نور ورحمت ایزدی ٹھہرے جو هدیً وذکریِ لاولی لالباب یعنی اصحاب فہم کے لئے ہدایت اور نصیحت ہے (سورہ مومن آیت پچاسویں)۔

[1]سورہ فاطر ۲۳ویں آیت۔

چوتھا باب

اس امر کا بیان کہ عہدِ عتیق وجدید کی کُتُب مقدسہ میں حضرت محمد کے ایام سے پیشتر یا انکے بعد کسی طرح کی تحریف وتخریب نہیں ہوئی

ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن بائبل کو کلام اللہ کہتاہے (سورہ بقرہ ۷۰ویں آیت) اور کئی بار بیان کرتا ہے کہ کلام اللہ میں تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا۔ اگر یہ دونوں باتی صحیح ودرست ہیں جن کو بھی اہل اسلام کی طرح درست وصحیح مانتے ہیں) توصاف نتیجہ نکلتا ہے کہ بائبل میں حضرت محمد کے ایام سے پیشتر یاان کے بعد کسی طرح کا تغیر وتبدل نہیں ہوا۔

لیکن اس سے ہم کو دیکھنا ہے ضروری ہے کہ قرآن دراصل اس مضمون پر بالکل متفق الرای نہیں ہیں لیکن پھر بھی ہم دیکھینگے کہ وہ جہلا کے خیال کی ہر گز ہر گز تائید نہیں کرتے۔

سورہ کہف کے چوتھے رکوع میں مرقوم ہے وَاتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ یعنی اور پڑھ جو وحی ہوئی تجھ کو تیرے رب کی کتاب سے ۔ کوئی بدلنے والا نہیں اس کی باتیں ۔ اس میں شک نہیں کہ یہ آیت پہلے خود قرآن ہی کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔ لیکن آخری جملہ میں

عام طور سے کلام اللہ کی طرف اشارہ ہے چونکہ بائبل مسلمہ طور سے کلام اللہ ہے اور خاص عام میں شامل ہوتا ہے لہذا بائبل میں تغیر وتبدل ناممکن ہے۔ بیضاوی لکھتاہے " کوئی انسان ایسا نہیں جو کلام اللہ کو بدل سکے ۔ خدا خود چاہے تو بدل سکتا ہے " پھر سورہ یونس کے ساتویں رکوع کی چوتھی آیت میں مندرج ہے لاتبدیل لکلمت اللہ یعنی اللہ کی باتیں بدلتی نہیں ہیں۔ اس پر بیضاوی کہتا ہے " اللہ کی باتیں غیر متغیر اوراس کے وعدے لاتبدیل ہیں" پھر سورۃ الانعام کے چوتھے رکوع میں لکھا ہے کہ وَلاَ مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللّهِ یعنی اللہ کی باتوں کے لئے کوئی بدلنے والا نہیں ۔ پھر چودھویں رکوع میں مسطور ہے لاَّ مُبَدِّلِ لِكَلِمَاتِهِ یعنی اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ اس آخری آیت کی تفسیر میں بیضاوی لکھتاہے کہ تورات محرف ہے لیکن اب عنقریب ہی ہم دیکھینگے کہ اس کا کیا مطلب ہے۔

مسئلہ تحریف کی خوب تحقیق کرنے کے بعد بعدزمانہ حال میں بڑے بڑے نامی گرامی اسلامی علمایِ ہند اس امر کے معترف ہوگئے ہیں کہ عہدِ عتیق اور عہدِ جدید کی کتابیں مبدلہ ومغیرہ نہیں ہیں اور جیسا کہ جہلا کا خیال ہے وہ محرفہ بھی نہیں۔ امام فخر الدین الرازی بھی اس رای کی تائید کرتا ہے۔ چنانچہ سورہ آل عمران کی ۷۷ویں آیت کی تفسیر میں اس سوال کے جواب میں کہ جب تورات کی شہرت بنی آدم میں ایسی بڑی تھی تو اس میں تحریف کیسے ممکن ہوئی ؟ امام صاحب نے ایک ایسا بیان پیش کیا جو نہایت غور طلب ہے۔

چنانچہ پہلے تو وہ کہتا ہے " شاید یہ کام ایک ایسی قلیل جماعت سے شروع ہوا جس کے لئے تحریف کرنے پر متفق ہونا ممکن تھا۔ پھر انہوں نے اپنا محرفہ نسخہ عام لوگوں کو دکھایا اور اس قیاس پر تحریف ممکن ہوسکتی ہے"۔ لیکن یہ محض ایک قیاس ہی ہے ۔ مفسر کی اپنی اصلی رائے نہیں ہے کیونکہ اس قیاس کے بعد وہ اپنی رائے یوں درج کرتاہے"۔ اور میرے خیال میں اس آیت کے مطلب کی تفہیم کا زیادہ ٹھیک طریقہ یہ ہے کہ جن آیات میں حضرت محمد کی نبوت کا ثبوت تھا وہ ہمیشہ غور وفکر کے لائق تھیں اور لوگ ان کے بارے میں طرح طرح کے سوالات واعتراضات کیا کرتے تھے۔ اس لئے ان آیات کے مندرجہ ثبوت ودلائل سامعین کے لئے مشکوک ہوتے جاتے تھے اور یہودی کہا کرتے تھے کہ ان آیات کا مطلب وہی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے نہ کہ وہ جو تم نے بیان کیا ہے ۔ پس تحریف کرنے اور زبانوں کے مروڑنے کا مفہوم یہی ہے (الرازی جلد دوم صفحہ ۷۲۰ او ۷۲۱) جلد سوم کے صفحہ ۳۳۷و۳۳۸ پر سورہ نساء کی اڑتالیسویں آیت کی تفسیر میں بھی وہ یہی دو خیال ظاہر کرتا ہے لیکن وہ ایک تیسری رائے بھی پیش کرتا ہے اوروہ یہ ہے کہ بعض کی روایت کے مطابق " وہ آنحضرت کے پاس آکر ایک معاملہ کے بارے میں پوچھا کرتے تھے اورآنحضرت ان سے ایسا بیان کرتے تھے کہ وہ سمجھ سکیں لیکن جب وہ آنحضرت کے پاس چلے جاتے تھے توآنحضرت کے الفاظ کو بدل ڈالتےتھے" اس رائے کے مطابق صاف ثابت ہوتا ہے کہ یہودی لوگ کتب مقدسہ کی

تحریف نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے سوالات کے جوابات میں حضرت محمد جو کچھ کہتے تھے وہ آنحضرت کے حضور سے نکل کر اس کو بدل کر بیان کرتے تھے۔ بہر حال اگر ہم امام فخرالدین الرازی کی اپنی رائے کو قبول کریں تو اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہودی لوگ کتب مقدسہ کو محرف نہیں بناتے تھے بلکہ کتب مقدسہ کی خود کردہ تفاسیر کو اور یہ بھی فقط زبانی ہوتا تھا۔ تحریر میں نہیں آتا تھا۔

سورہ مائدہ کی ۱۶ویں آیت کی تفسیر میں امام رازی [1] ایک حکایت بیان کرتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہودی لوگ تورات [2] کو بلند آواز سے پڑھتے وقت اپنی زبانوں کو مروڑتے تھے اور سنگسار کرنے کی جگہ کوڑے مانا پڑھتے تھے۔ یہ زبانی ہوتا تھا۔ کتب مقدسہ کی اصلی عبارت میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی تھی۔ پھر اسی سورۃ کی ۴۵ویں آیت کی تفسیر میں بیضاوی بھی یہی حکایت بیان کرتا ہے ۔ یُحَرِّفُونَ الْکَلِمَ مِن بَعْدِ مَوَاضِعِہٖ کا مطلب یوں بیان کرتا ہے کہ (۱) یا تو وہ زبانی الفاظ کو چھوڑ دیتے ہیں یا ان کی جگہ بدل دیتے ہیں۔(۲) یا ان سے وہ بات مراد لیتے ہیں جو فی الحقیقت ان سے مراد نہیں ہے

[1] جلد سوم صفحہ ۵۹۰ ۔اس کے متعلق آیت الرجم کے بارے میں عبداللہ ابن عمر کی روایت سے وہ حدیث بھی ملاحظہ ہو جس لکھا ہے کہ ایک یہودی نے آیت الرجم کے ماقبل ومابعد کی عبارت پڑھتے وقت اس آیت کو ہاتھ سے چھپالیا۔ مشکواۃ۔ کتاب الحدود باب اول صفحہ ۳۱۰

[2] استثنا ۲۲: ۲۳تا ۲۴

اور ان کا ایسا استعمال کرتے ہیں جو صحیح نہیں ہے (جلد اول صفحہ ۲۵۸)۔ اب اگر ہم یہ دریافت کرنا چاہیں کہ ان مندرجہ بالا دونوں تفسیروں سے کونسی ٹھیک ہے تو ہم کو کتاب استثنا کے ۲۲ویں اور ۲۴ویں آیت کو اصلی عبرانی یا کسی نئے پرانے ترجمہ میں پڑھنا چاہیے ۔اس مقام پر ہم دیکھتے ہیں کہ تورات میں آیۃ الرجمہ تاحال موجود ہے جیسا کہ قرآن واحادیث [3] سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت محمد کے ایام میں موجود تھی۔ پس ہم صاف دیکھتے ہیں کہ یہودیوں نے نہ اس آیت کو عبارت سے خارج کیا اور نہ اس کے الفاظ میں کسی طرح کی تحریف کی ہے یعنی الفاظ میں تقدیم وتاخیر بھی نہیں جو کہ تحریف کا ٹھیک مطلب ہے۔ فقط زبانی تحریف کا ذکر۔ تورات کی مرقوم عبارت میں کسی طرح کی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ۔جہاں تک ہم احادیث سے معلوم کرسکتے ہیں نہایت تعجب کی بات ہے کہ آیۃ الرجمہ خود قرآن میں موجود تھی ۔مشکواۃ المصابیح کتاب الحدود باب اول کے صفحہ ۳۰۱ پر مرقوم ہے کہ حضرت عمر نے کہا" البتہ خدا نے محمد کو سچائی کے ساتھ بھیجا ہے اور اس پر کتاب نازل فرمائی اور جو کچھ خدا نے نازل فرمایا اس میں ایۃ الرجم تھی۔ رسول اللہ نے پتھر مارے اور اس کے بعد ہم نے پتھر مارے اور پتھر مارنا یعنی سنگسار کرنا کتاب اللہ میں برائی کے حق میں میں عین انصاف ہے"۔ جبزیز بن ثابت نے قرآن کو جمع کیا تو یہ آیت

[3] مشکواۃ المصابیح صفحہ ۳۰۱

خارج کردی کہ مبادا کوئی یہ کہے کہ حضرت عمر نے کچھ[1] زائد کردیا۔ اگرہم حضرت عمر خلیفہ کی بات کو سچ مانیں تو کلمات کو ان کی جگہ سے دور کرنا ایۃ الرجم کے باب میں قرآن میں وقوع میں آیا نہ کہ تورات میں اور یہ یہودیوں سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے ہوا۔

قرآن میں بعض اوقات یہودیوں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ عہد عتیق کی اس مضمون پر تعلیم کے متعلق سوالات کے جوابات میں جان بوجھ کر حق بات کو چھپاتے[2] اوراپنی زبانوں کو مروڑتے[3] ہیں اور کلام اللہ کو اپنی پیٹھ پیچھے [4] پھینکتے ہیں ۔ یہودیوں پر تحریف کا الزام فقط چار مقامات پر مندرج ہے یعنی سورہ بقرہ آیت ۴۷ ، سورہ نساء آیت ۴۸ ، سورہ مائدہ آیت ۱۶ اور ۴۵ میں۔ اس مقام پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس الزام کا مطلب خواہ کچھ ہی ہو یہ فقط یہودیوں ہی پر لگایا گیا ہے ۔ مسیحی اس سے بالکل بری ہیں اور یہ واحد حقیقت اس امر پر نہایت صفائی اور صراحت کے ساتھ دلالت کرتی ہے کہ عہدِ جدید حضرت محمد سے پیشتر اوران کے ایام میں تحریف کے مشائبہ اور محرف ہونے کے الزام سے بالکل پاک ہے۔ اب ہم اس پر غور کرینگے کہ قرآن یہودیوں پر جو

[1] حاشیہ مشکواۃ صفحہ ۳۰۱

[2] سورہ بقرہ آیت ۴۱

[3] سورہ آل عمران آیت ۷۷

[4] سورہ بقرہ آیت ۱۰۰

تحریف کا الزام لگاتا ہے اس کا مطلب کیا ہے ہم یہ تو دیکھ چکے ہیں کہ بیضاوی اورامام فخرالدین الرازی باستثنایِ سورہ بقرہ آیت ۴۷ مندرجہ بالاچاروں آیات کی تفسیر میں کیا کہتے ہیں۔ اس مستثنےٰ آیت کی تفسیر میں متفق الرای[5] ہو کر کہتے ہیں کہ جس تحریف کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یہودی تورات کا غلط مطلب بیان کرتے تھے اورجان بوجھ کر اس کی مندرجہ تعلیمات کوچھپاتے تھے (دیکھو سورہ انعام آیت ۹۲ویں جہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان کے پاس لکھی ہوئی تورات موجود تھی لیکن وہ فقط ایک حصہ دکھاتے تھے اور اس کا ایک حصہ یا زیادہ تر چھپاتے تھے) ایسا کرنا بہت بُرا تھا لیکن یہ امر دیگر ہے اور تورات کی اصل عبارت کو بدلنا امر دیگر ۔اگرہم یہ پوچھیں کہ یہودیوں نے تحریف کے جرُم کا ارتکاب کب کیا؟ تو بیضاوی کہتا ہے کہ حضرت محمد کے ہمعصروں کے باپ دادا کے زمانہ میں ۔ لیکن الرازی کہتا ہے کہ جن پر تحریف کا الزام لگایا گیا ہے یہ وہی تھے جو حضرت محمد کے زمانہ میں موجود تھے ۔ یہ دونوں مفسر ان لوگوں کی رائے کو بھی لکھتے ہیں جن کا خام خیال یہ ہے کہ یہودیوں نے جان بوجھ کر کُتُب مقدسہ کو بدل ڈالا۔ لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی اس خیال کو درست نہیں مانتا۔الرازی[6] سوال کرتا ہے کہ الکتاب میں یہ کیونکر ممکن ہے ؟ اس کے حروف کا ٹھیک شمار اورا سکے الفاظ کی تعداد

[5] الرازی جلد اول صفحہ ۳۷۳ سے ۳۷۵ تک ۔ بیضاوی جلد اول صفحہ ۶۷ اور ۶۸

[6] جلد سوم صفحہ ۳۳۷و ۳۳۸

معین تھی اور متواتر روایات کے سلسلہ سے ان لوگوں تک پہنچی تھی اور مشرق ومغرب میں مشہور ومعروف تھے ۔ وہ یہ بھی کہتاہے کہ شائد کوئی یہ کہے کہ وہ لوگ بہت تھوڑے تھے اور جن کو کتاب کا علم تھا وہ اور بھی تھوڑے تھے اور اس لئے اس تحریف کا وقوع میں آنا ممکن تھا۔ لیکن وہ اس خیال کو رد کرکے لکھتاہے کہ " تحریف سے مراد یہ ہے بے بنیاد شکوک وغلط معانی کو داخل کرنا اور الفاظ کو ان کے اصلی معانی سے زبانی چالاکی کے وسیلہ سے پھیرنا جیسا کہ زمانہ حال میں ملحد ان آیات کے ساتھ کرتے ہیں جو ان کے دین کی مخالفت کرتی ہیں۔ " فخر الدین الرازی اسی رائے کو منظور کرتاہے اوراسی کی تائید کرتاہے۔ پس وہ اس طرح سے یہودیوں کو عہدِ عتیق کو محرف بنانے کے الزام کے شک وشبہ سے بالکل بری کردیتاہے۔ لہذا جب قرآن کہتاہے کہ تورات محرف ہے تو اس کا ہر گز ہر گز وہ مطلب نہیں جو زمانہ حال کے جہلانے سمجھ رکھا ہے۔

پس اگر کوئی مسلمان یہ کہے کہ عہدِ عتیق وجدید کی اصل عبارات بدل گئی ہیں اور جس صورت میں وہ حضرت محمد کے ایام میں تھے اب موجود نہیں ہیں تو وہ قرآن کی تکذیب کرتاہے اوراس کتاب کی صداقت کا منکر ہوتاہے جس کو تمام سچے مسلمان منجانبِ اللہ اور تورات وانجیل کی مصدق [1] مانتے ہیں ۔ یوں کہنا تو ناممکن ہے کہ قرآن تورات وانجیل کی صداقت اوران الہامی ہونے کی بھی تعلیم دیتاہے اورساتھ ہی یہ بھی کہتاہے کہ وہ ایسی محرف ہو گئی ہیں کہ اعتماد کے قابل نہیں رہیں کیونکہ ایسا کہنا گویا قرآن پر الزام لگاناہے کہ وہ اپنی آپ ہی تکذیب کرتاہے۔ کوئی مومن جو خدای برحق پر ایمان رکھتا ہے۔ یہ نہیں مان سکتا کہ اللہ جل شانہ نے قرآن کو ایک ایسی محرف کتاب کی تصدیق کرنے کے لئے نازل فرمایا جو محرف ہونے کے سبب سے غلط تعلیم دیتی تھی۔ جن مفسرین کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے وہ ہمارے اس دعوے کی تائید کرتے ہیں کہ بائبل حضرت محمد کے ایام میں یا ان سے پیشتر محرف نہیں ہوئی۔

اب فقط یہ دریافت کرنا باقی ہے کہ آنحضرت کے بعد بائبل میں تحریف ہوئی ہے یا نہیں ؟ اس کا جواب کچھ مشکل نہیں ہے ۔ جن مسودوں کا ہم ذکر کرچکے ہیں جو حضرت محمد کی ولادت سے بہت عرصہ پیشتر کے ہیں انہیں سے نقل کرکے موجودہ بائبل چھاپی گئی ہے لہذا یہ فرض کرنا بھی بالکل ناممکن ہے کہ حضرت محمد کی وفات کے بعد یہودیا نصاریٰ نے بائبل کی تحریف وتخریب کی۔

لیکن اس کے خلاف جو کچھ کہا جاتاہے وہ بھی سننا چاہیے۔ اہلِ اسلام میں سے تمام جہلااور بعض علما بھی جنہوں نے اس مسئلہ تحریف پر کافی غور وفکر سے کام نہیں لیا تاحال اس وہم میں گرفتار ہیں کہ موجودہ بائبل محرف ہے۔ اگر ان سے یہ سوال کیا جائے کہ یہ تحریف کب ہوئی تو ان کے جوابات مختلف ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ " حضرت محمد کے ایام سے پیشتر"۔ بعض کہتے ہیں "

---

[1] سورہ مائدہ آیت ۵۲

آنحضرت کے بعد" اور بعض کہتے ہیں کہ "پیشتر اور بعد" اس کے ثبوت میں ان کے پاس وہی احمقانہ اور بے بنیاد الزامات ہیں جو سیلسس جیسے کافروں اور مانی کے پیروؤں جیسے ملحدوں نے بائبل پر لگائے ہیں۔ان الزامات واعتراضات کی پورے طور سے تردید ہوچکی ہے اور مغربی علما پر ان کی کچھ تاثیر نہیں ہوتی اور نا ممکن ہے کہ حقیقی علمائے اسلام آئندہ ان سے فریب کھائیں۔ بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ پہلی چند صدیوں کے بعض مسیحیوں نے یہودیوں پر عہدِ عتیق میں تحریف کرنے کا الزام لگایا۔ بعض جاہل مسیحیوں نے کہا تھا کہ یہودیوں نے پیدائش کے پانچویں اور گیارھویں باب کی مندرجہ اعمارِ بزرگان کی تعداد کو بدل ڈالا کیونکہ عبرانی اصل اور یونانی ترجمہ میں یہ عمریں مختلف تھیں۔ لیکن یہ سچ نہیں ہے کہ آگستین کا بھی یہی خیال تھا۔ اب قریباً چودہ سوسال کی تحقیقات کے بعد کوئی صاحب علم اس بات کو نہیں مانتا کہ یہودیوں نے اپنی کتبِ مقدسہ کی عبارات مندرجہ بالا یا دیگر عبارات کو بدل ڈالا۔

بعض مصنفینِ اسلام کہتے ہیں کہ بائبل میں بہت سا اختلافِ قرات موجود ہے اور یہ بات تحریف کا ثبوت ہے۔ لیکن یہ دلیل بے بنیاد ہے ۔ ہمارے پاس بائبل کے بہت سے مسودے عبرانی، یونانی اور بہت سنی اور زبانوں میں موجود ہیں اور جب ہم ان کا باہم مقابلہ کرتے ہیں تو ضرور اختلافِ قرات نظر آتا ہے۔ ایسی حالت میں دیگر تمام کُتبِ قدیم میں بھی اختلافِ قرات موجود ہے۔ ہمارے پاس بائبل کے بہت سے مسودے عبرانی، یونانی اور بہت سی اور زبانوں میں موجود ہیں اور جب ہم ان کا باہم مقابلہ کرتے ہیں تو ضرور اختلافِ قرات نظر آتا ہے۔ ایسی حالت میں دیگر تمام کُتب قدیم میں بھی اختلافِ قرات موجود ہے۔ لیکن اب ہم ذرا دیکھیں کہ یہ اختلافِ قرات کس قسم کا ہے ۔ بہت سی حالتوں میں توفقط ہجا میں اختلاف ہے جیسا کہ عربی زبان میں کسی کتاب میں صلواۃ اور کسی دوسری میں صلاۃ ۔ ایک میں حیواۃ اور دوسری میں حیاۃ ۔ ایک میں توریت اور دوسری میں تورات ایک میں قیامۃ اور دوسری میں قیمۃ ۔ پھر بعض حالتوں میں صیغہ افعال کی صورتیں مختلف ہیں جیسے کہ مفسرین قرآن کی تفاسیر سے قرآن میں اختلاف قرات پایا جاتا ہے ۔ مثلاً[1] بیضاوی سورہ بقرہ کے تیرھویں رکوع کی تیسری آیت کے پہلے حصہ میں ذیل کا اختلاف قرات پیش کرتا ہے۔

عام قرات ما ننسخ من اية او ننسها

ابن عامر کی	قرات	ما ننسخ وغیرہ
ابن کثیر کی	قرات	ننساھا
اوروں کی	قرات	ننسھا
اوروں کی	قرات	تنسھا
اوروں کی	قرات	ننسھا
اوروں کی	قرات	ننسکھا

---

[1] جلد اول صفحہ ۷۸۔

عبداللہ[1] کی قرات ماننسک من ایۃ اوننسھا

پھر سورہ بقرہ آیت ۲۸۵ میں بھی بیضاوی[2] کا ذیل کا اختلافِ قرات بیان کرتا ہے۔

(۱) عام قرات	وکتبہ
حمزہ ولکسائی کی قرات	وکتابہ
(۲)عام قرات	لانفرق
یعقوب کی قرات	لایفرق
اوروں کی قرات	لایفرقون

علاوہ بریں سنی مفسرین اور بھی بہت سی آیات میں اختلافِ قرات مانتے ہیں ۔ مثلاً سورہ انعام آیت ۱ ۹ ۔ سورہ مریم آیت ۳۵۔ سورہ قصص آیت ۴۸۔ سورہ احزاب آیت ۶ ۔ سورہ سبا آیت ۱۸ اور سورہ ص آیت ۲۲[3] میں ۔ ان اختلافات سے معانی میں نہایت خفیف سی تبدیلی ہوتی ہے لیکن قرآن کی تعلیم نہیں بدلتی۔ پر اگر ان اختلافات کی بنا پر کوئی مسیحی کہے کہ قرآن محرف ہے تو علمایِ اسلام کیا جواب دینگے ؟ ان کا یہ کہنا درست ہوگا کہ جو کوئی ایسا نتیجہ نکالتا ہے ۔ وہ محض لاعلمی اور ہٹ دھرمی کا اظہار کرتا ہے۔ جو لوگ بائبل کے اختلاف قرات کے سبب سے اس پر اس قسم کا الزام لگاتے ہیں ان کو بھی ایسا ہی جواب دیا جاسکتا ہے۔ لیکن تہذیب ہم کو روکتی ہے اوراس لئے ہم اپنے مخالفین کے حق میں ایسے الفاظ استعمال نہیں کرتے ۔ قرآنی اختلافِ قرات سے بائبل کا اختلاف قرات بہت زیادہ ہے اوراس کے اسباب حسب ذیل ہیں :(۱) بائبل کا حجم کم از کم قرآن سے چوگنا ہے۔ (۲) بائبل بہت زیادہ قدیمی ہے (۳) بائبل عبرانی، آرامی اوریونانی زبانوں میں لکھی گئی نہ کہ قرآن کی طرح فقط ایک ہی زبان میں ۔(۴) تمام مختلف قدیم ترجموں میں اختلافِ قرات شمار کیا گیا ہے۔ اگرچہ بعض حالتوں میں بجایِ اصل عبارت میں اختلاف کے مترجمین کی غلطی ثابت ہوتی ہے۔(۵) قرآن کے مقابلہ میں بائبل کے اختلافاتِ قرات کے جمع کرنے میں بہت زیادہ احتیاط واہتمام سے کام لیا گیاہے۔(۶) بائبل کی اصل عبارت کی قرآن کی طرح حضرت عثمان نے تصحیح وترمیم نہیں کی اور نہ ہمارے درمیان کوئی مروان ہی ہواہے جس نے قرآن کے قدیم ترین نسخہ کو بھی جسے عثمان[4] نے باقی رہنے دیا تھا جلادیا۔ بائبل کے تمام اختلافاتِ قرات پر نظر کرنے سے ہر گز ہر گز مسیحی دین کی کسی تعلیم میں کسی طرح کی تبدیلی نظر نہیں آتی۔

---

[1] بیضاوی کی ایک اور طبع جلد اول صفحہ ۱۰۴، ۱۰۵

[2] جلد اول صفحہ ۴۳

[3] مگر دیگر اختلافاتِ قرات اس کتاب کے مطالعہ میں آگے چل کر ملینگے۔

[4] حضرت عثمان کے ہاتھوں قرآن کی تصحیح وترمیم کا بیان مشکواۃ المصابیح کے صفحہ ۱۸۵ و ۱۸۶ پر ملاحظہ کیجئے۔ اس مقام پر لکھا ہے کہ تصحیح وترمیم کے بعد اس نے حکم دیا کہ حفصہ کے نسخہ کے سوا قرآن کے تمام پرانے نسخے جلادئے جائیں لیکن جب مروان مدینہ کا حاکم ہوا تو اس نے وہ باقی ماندہ نسخہ بھی جلادیا۔

بعض اوقات مفسرین بائبل کسی لفظ یا آیت کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں اور اس بنا پر انہوں نے خیال کیا ہے کہ لکھنے والے نے نقل کرنے میں کوئی غلطی کی ہے اور غلط نوشتے کی معنی میں اسے مصحف یعنی نادرست کہا۔ لیکن شیخ رحمت اللہ جیسے اسلامی مناظرین نے لفظ مصحف کا غلط ترجمہ محرف کرلیا اور کہا کہ مسیحی مفسرین بائبل کو محرف مانتے ہیں۔ ایسی غلطی کی تصحیح کی طرف توجہ دلانا ہی کافی ہے۔ مثلاً دانی ایل کی کتاب کے تیسرے باب کی دوسری اور تیسری آیت میں ارامی اصل میں لفظ (تفتائی) پایا جاتا ہے۔ یہ لفظ کسی اور کتاب میں موجود نہ تھا اور اس کے ٹھیک معنی اور مخرج کا کچھ پتہ نہ تھا لہذا بہت سے مفسرین نے کہہ دیا کہ یہ لفظ مصحف یعنی لکھنے والے کی غلطی کا نتیجہ ہے لیکن چند ہی سال گذرے ہیں کہ ملکِ مصر میں ارمنی زبان کا ایک کتبہ برآمد ہوا تھا جس میں یہ لفظ مندرج ہے اور اب ہم اس لفظ کے مخرج ومعنی کو دریافت کرچکے ہیں۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ اصل عبارت کس طور سے محفوظ رکھی گئی ہے یہاں تک کہ ایسے الفاظ بھی۔

اگر بائبل میں ایسی عجیب[1] اور نرالی باتیں پائی جاتیں جیسی کہ سورہ طٰہٰ کے تیسرے رکوع میں مرقوم ہے ان ھذین تو بعض مفسر خیال کرتے کہ کاتب نے غلطی سے ان ھذین کی جگہ ان ھذان لکھ دیا ہے اور تصحیح کی کوشش کرتے جیسا کہ سورہ بقر کی ۲۸۵ ویں آیت کے متعلق ہم بیضاوی کے بیان سے صاف دیکھ چکے ہیں کہ غالباً نفرق کی جگہ یفرق اور یفرقون جو کہ بعض نسخوں میں مندرج تھا اسی قسم کی کوشش کا نتیجہ تھا۔

اب قرآن کے اختلاف قرات سے ہماری کچھ بحث نہیں ہے لیکن ہم فقط بائبل کے اختلافِ قرات کی تفہیم کی غرض سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ بائبل کے تمام قابل لحاظ اختلافاتِ قرات تین حصوں میں منقسم ہوسکتے ہیں۔ (۱) وہ جن کا سبب کاتبوں کی بے پروائی یا لاعلمی ہے۔ (۲) وہ جن کا سبب اس مسودہ کا کوئی عیب ہے جس سے نقل کی گئی ہے۔ (۳) وہ جو کسی کاتب نے پہلے کاتب کی صحیح تحریر کو غلطی کی گئی غلط سمجھ کر صحیح بنانے کی کوشش کی۔ کتبِ مقدسہ کو دانستہ محرف بنانے کی کوشش کا خیال بالکل مفقود ہے۔ بیشک ملحدوں نے بعض اوقات اپنی عجیب تعلیمات کی تائید میں عہدِ جدید کے اپنے نسخوں سے ایسی آیات پیش کیں جو اور کہیں بھی نہیں پائی جاتی تھیں اور عموماً انہوں نے یہ بیان کیا کہ چند خاص آیات جو ان کی اغلاط کی تردید کرتی تھیں اصلی نہ تھیں لیکن پھر بھی یہ لوگ از خود فریب خوردہ تھے اور انہوں نے بھی دیدہ دانستہ کتبِ مقدسہ کو محرف بنانے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن ہر حالت میں مسیحیوں نے اپنے قدیم مسودوں کو دیکھ کر اپنی غلطیوں کو معلوم کرلیا ۔ اسی طرح سے اگر بعض یہودی یا مسیحی مجذوب عہدِ عتیق یا جدید کی ایسی عبارات کو جن میں حضرت محمد کا ذکر تھا بدلنے یا خارج کرنے کے وسیلہ سے محرف بنانے کی کوشش کرتے تو دنیا کے باقی یہودی اور مسیحی ایسے لوگوں کے

[1] دیکھو منارالحق صفحہ ۱۴، ۱۵، ۱۶

محرف نسخوں کو ہر گز ہر گز قبول نہ کرتے جیسا کہ انہوں نے مارسن کی اس
کوشش کو رد کیا جو اس نے انجیل لوقا کے پہلے دو باب خارج کرنے میں کی تھی۔
اس حقیقت کا پایا جانا کہ حضرت محمد کی ولادت سے بہت عرصہ پیشتر بعض
ملحدوں نے کوشش کی اور عہدِ جدید کو محرف بنانے میں ناکامیاب رہے اور اس
امر کا بین ثبوت ہے کہ اس کو محرف بنانا ناممکن ہے۔

اگر کوئی ذی مقدرت بادشاہ یا حاکم حضرت موسیٰ کی وفات سے
تھوڑی دیر بعد تورات یا تورات کے جداگانہ ابواب کے سب نسخے جمع کرکے
ایک نیا نسخہ شائع کرتا اور بعض آیات کے حصول کے لئے لوگوں کی قوت حافظ
پر بھروسا رکھتا اور بعض ہڈی اور لکڑی کے کتبوں سے نقل کرتا اور پھر ان کتبوں
اور تمام قدیم نسخوں کو جو اسے مل سکتے جلادیتا اور اس طرح سے لوگوں کو مجبور
کرتا کہ فقط اسی کے مرتبہ نئے نسخہ کو استعمال کریں تو غالباً توریت میں اختلافِ
قرات بہت ہی کم ہوتا لیکن اس کی صحت ودرستی بالکل قابل اعتماد نہ ہوتی۔
اگر پہلی صدی کے خاتمہ پر عہدِ جدید کی تمام کتب کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوتا تو
کسی طرح سے یہ ثابت نہ ہوسکتی کہ نیا نسخہ امر ناط وتفریط کے وسیلہ سے محرف
نہیں بنایا گیا اور کوئی صاحب علم محقق تمام کتاب میں سے کسی ایک آیت کو
بھی پورے طور سے قابل اعتماد نہ سمجھ سکتا۔ لیکن الحمد اللہ والمنتہ کے بائبل
کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا گیا۔ ہم مسیحیوں میں کبھی کوئی عثمان پیدا نہیں
ہوا۔ رومی شہنشاہ گلیریس اور ڈایو کلیشین چونکہ بے دین تھے اس لئے انہوں نے
کوشش کی کہ کتب مقدسہ کے تمام نسخے جمع کرکے جلادیں لیکن مسیحیوں نے اپنی
جانیں نثار کردیں اور اپنی کتابیں ان کے حوالہ نہ کیں۔ پھر بعد کے ظالموں نے
بھی اسی طرح کی کوششیں کیں اور اسی طرح ناکامیاب رہے۔ بالفرض اگر ہماری
تمام کتابیں جلا بھی دی جاتیں تو بھی بائبل نیست نہ ہوتی کیونکہ یسعیاہ کے
۴۰ ویں باب کی ۸ ویں آیت میں یوں مرقوم ہے کہ "ہمارے خدا کا کلام ابد
قائم ہے"۔ ہر زمانہ میں بہت سے مسیحیوں نے عہدِ عتیق وجدید کے اہم ترین
حصوں کو اور خصوصاً زبوروں اور اناجیل کو حفظ کیا ہے لہذا جب تک تمام مسیحی
نیست نہ ہوجاتے کلام اللہ نیست نہیں ہوسکتا تھا۔ سولھویں صدی میں ملکِ
فرانس کے ظلم وستم کے ایام میں بہت سے مسیحی خادمان دین کو بائبل کی
بعض پوری کتابوں کو حفظ کرنا پڑتا کہ اگر ان کی کتابیں ان سے چھین بھی لی
جاتیں تو اپنے لئے اور اپنے لوگوں کے لئے چشمۂ نجات سے آبِ حیات بہم
پہنچاسکتے ۔ علاوہ بریں یہ بھی مخفی نہیں کہ یہود ونصاریٰ نے ہر زمانہ میں اپنی
کتب مقدسہ کی بڑی حفاظت کی ہے اور ان کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھا
ہے۔ لہذا یہ کہنا کہ سنہ ہجری سے پیشتر یا بعد ازاں بالارادہ یا بلاارادہ یہ کتابیں
محرف کردی گئی ہیں بالکل انہونی بات سے منہ نکالنا ہے۔ فقط جہلا اور متعصب
لوگ ہی بائبل پر اس قسم کا الزام لگاسکتے ہیں۔

اس امر کو آفتابِ نصب النہار سے روشن تر بنانے کے لئے اب ہم
اس بات پر غور کریں گے کہ یہود ونصاریٰ کو اپنی کتب مقدسہ کو محرف بنانے

میں کونسے فوائد مدِ نظر تھے؟ وہ خوب جانتے تھے کہ ایسا کرنے کی کوشش کرنا خدا تعالیٰ کی نظر میں گنہگار بننا اور اپنے آپ پر سخت عذاب نازل کرنا ہے کیونکہ عہدِ عتیق (استثنا ۴: ۲) اور عہدِ جدید (مکاشفات ۲۲: ۱۸ تا ۱۹)میں یہ تعلیم موجود ہے۔علاوہ بریں ایسے فعل سے وہ اپنے ہی دین کو برباد کرتے اور اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد کو ہمیشہ کے لئے راہِ نجات سے گمراہ کرتے ۔ اگر ایشیائی یہود و نصاریٰ حضرت محمد اور ان کے مومنین سے دینوی فوائد کے آرزومند ہوتے تو جیسا کہ مسلمان ان پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے ان آیات کو جو حضرت محمد کے دعاوی کی تائید میں تھیں خارج کردیا بخلاف اس کے ایسی آیات داخل کرنے کی کوشش کرتے۔ حضرت محمد کو رد کرنے سے وہ اپنے آپ پر اور اپنی اولاد پر "جزیہ[1] دینے اور ذلیل ہونے" کی مصیبت لا رہے تھے اور ذمی بننے کی بے عزتی اٹھا رہے تھے ۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وقتاً فوقتاً ان کے لئے ہولناک قتل کا خطرہ تھا اور ناگفتہ بہ بے رحمی کا امکان تھا جیسی کہ ادانہ اور اس کے قرب وجوار میں ۱۹۰۹ء میں ہوئی ۔ صدہا سال سے یہ وحشت اثر نظارے سورہ توبہ کے ان الفاظ کا واجبی نتیجہ ہیں کیونکہ ظالم حکام اور جہلا کی جماعتوں نے ان الفاظ کا مطلب ایسا ہی بیان کیا ہے۔اگر یہود و نصاریٰ حضرت محمد کو نبی تسلیم کرلیتے تو نہ فقط وہ اس بے رحمی اور بدسلوکی سے بچ جاتے بلکہ علاوہ بریں ان تمام دینوی فوائد وحقوق میں بھی شامل ہوتے جو اہل اسلام ہی کا حصہ ہیں۔ لیکن بخلاف اس کے وہ اپنے آبائی دین میں قائم رہے اگرچہ ان کو معلوم تھا کہ ترکی کی سلطنت کی تمام مسجدوں میں نمازِ جمعہ میں تمام مسلمان ان سے نفرت کا اظہار کرکے یہ ہولناک بددعا کرتے تھے" اے خدا ان کی زوجات کو بیوہ اور بچوں کو یتیم بنادے اور ان کے مال واسباب کو مسلمانوں کے قبضہ میں کردے"۔ کیا یہ بات بالکل صاف وصریح نہیں ہے کہ اگر یہود و نصاریٰ کی کتبِ مقدسہ میں حضرت محمد کے حق میں پیشین گوئیاں مندرج ہوتیں اور یہ حکم ہوتا کہ انتظار کریں اور جب وہ آئیں توان کو قبول کریں تو وہ لوگ خوشی سے ان کی پیروی اختیار کرتے اور اس طرح سے سعادت دارین حاصل کرتے ؟ لہذا ان کے سامنے ہر طرح سے ایسی ترغیب وتحریص کے سامان موجود تھے کہ وہ کتب مقدسہ سے کچھ خارج کرنے کی جگہ حضرت محمد کے حق میں کچھ داخل کرنے سے محرف بناتے اور چونکہ ایسی کوئی عبارات داخل نہیں کی گئی اس لئے صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنی کتبِ مقدسہ کو ہر گز ہر گز محرف نہیں بنایا۔ ایسی آیات کو خارج کرنا جوان کے لئے نہایت فائدہ مند ہوتیں اور اس طرح کی تحریف سے شقاوت وبدبختی کو مول لینا ایسی بات نہ تھی جس کے یہود یا نصاریٰ آرزومند ہوتے۔ اس امر پر غور کرکے کوئی بھی خیال میں نہیں لاسکتا کہ یہود و نصاریٰ نے تحریف کا کام کیا کیونکہ ایسا کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی اور اس کے خلاف کرنے کی کئی وجوہ موجود تھیں ۔

[1] سورہ توبہ آیت ۲۹

علاوہ بریں یہود و نصاریٰ میں سے اگر ایک جماعت اپنی کتب مقدسہ کو محرف بنانے کے لئے سازش کرکے کوشش کرتی تو دوسری جماعت ضرور اس کو دریافت کرکے ایسی جعل سازی کی کارروائی کو فاش کردیتی۔ حضرت محمد کے ایام میں بھی جیسا کہ ان سے پہلے اور پیچھے یہود و نصاریٰ میں سخت باہمی دشمنی تھی لہذا یہ خیال کرنا بالکل ناممکن ہے کہ عہدِ عتیق کو محرف بنانے کے لئے یہود و نصاریٰ میں باہمی اتفاق ہوگیا۔ اگر یہود و نصاریٰ کا کوئی فرقہ کسی ملک میں کتبِ مقدسہ کی تحریف پر اتفاق کربھی لیتا تو دوسرے ممالک کے دیگر فرقے اس کے اس ہولناک گناہ کے خلاف ضرور شور برپا کرتے۔ ہمارے پاس یہودی، مسلمان اور مسیحی مورخین کی کتبِ تواریخ موجود ہیں اور ان میں سے کسی میں بھی کہیں یہ بیان نہیں ملتا کہ حضرت محمد کے ایام میں یا بعد ازاں تحریف کی ایسی کوشش کی گئی۔

اگر کوئی فرقہ اس جرم کے ارتکاب کا خیال کبھی کرتا بھی تو اس کو عمل میں لانا بالکل ناممکن ہوتا کیونکہ سنہ ہجری سے پیشتر مسیحی دین ایسی وسعت کے ساتھ اشاعت پاچکا تھا کہ ایشیای کوچک۔ سیریا، یونان، مصر، ابی سینیا، شمالی افریقہ اور اٹلی کی زیادہ ترآبادی مسیحی تھی اور علاوہ برین عرب وفارس، آرمینیا وجارجیا، ہندوستان وفرانس، سپین و پرتگال اور انگلستان وجرمنی کے بہت سے باشندے مسیحی دین کو قبول کرچکے تھے۔ ان تمام ممالک میں مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں اور حضرت محمد کے ایام سے پیشتر ان میں سے بہت سی زبانوں میں بائبل کا ترجمہ کیا جاچکا تھا۔ مثلاً لاطینی، ارمنی، سریانی، قدیم مصری، ایتھیوپک، گاتھک، اورجارجین زبان میں۔ علاوہ بریں عہدِ عتیق عبرانی اصل میں اور عہدِ جدید یونانی اصل میں موجود تھا۔ عہدِ عتیق کا یونانی میں بھی ترجمہ کیا گیا تھا اوراس کے بہت سے حصہ کا ترجمہ ارمنی زبان میں بھی ہوگیا تھا۔ اور جن ممالک کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے ان سب میں یہودی موجود تھے۔ وہ بہت سے مختلف گروہوں میں منقسم تھے اور مسیحیوں کے بھی بہت سے فرقے تھے جن میں باہمی مخالفت تھی۔ اگر یہود و نصاریٰ کا کوئی فرقہ بھی کتب مقدسہ میں سے کسی کتاب کو محرف بنانے کی کوشش کرتا تو دیگر فرقے فوراً دریافت کرلیتے اور اس جرم کو نہایت بے رحمی کے ساتھ فاش کرتے۔ پس کوئی دیوانہ بھی اتنا دیوانہ نہیں کہ تمام یہود و نصاریٰ کو بائبل کی تحریف کے لئے متفق تصور کرسکے۔ لیکن اگر یہ تحریف وقوع میں آتی بھی توچونکہ حضرت محمد کی ولادت سے پیشتر کے بہت سے مسودے موجود ہیں اس لئے یہ جرم مدت کا فاش ہوگیا ہوتا۔ بہت سے قدیم ترجمے اور بائبل کی بہت سے منقولہ عبارات جو کہ حضرت محمد کے ایام سے پیشتر کی تصانیف میں پائی جاتی ہیں اس الزام کو غلط اور بالکل بے بنیاد ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ آنحضرت کے ایام میں یا بعد ازاں بائبل میں تحریف ہوئی۔

اہلِ اسلام میں سے جو یہ کہتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ نے اپنی کتب مقدسہ کو محرف بنایا ہے وہ اس جرم کے ارتکاب کا سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں

نے تحریف اس لئے کی کہ ان کتابوں میں جو پیشینگوئیاں حضرت محمد کے حق میں مندرج تھیں ان کو خارج کردیں۔ ہم بیان کرچکے ہیں کہ اہلِ کتاب کو ایسا کرنے میں کوئی فائدہ مدِ نظر نہیں ہوسکتا تھا اور بجائے ایسی عبارات اور پیشینگوئیاں کو خارج کرنے کے داخل کرنے کی ترغیب وتحریص کے سامان موجود تھے۔ لیکن مفسرین اسلام اوراس الزام کا جواب خود ہی دیدیتے ہیں جبکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت محمد کے حق میں بہت سی پیشینگوئیاں بائبل میں موجود ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو اظہر من الشمس ہے کہ یہود ونصاریٰ ان کو خارج کرنے کے جرم کے مجرم نہیں ہیں۔ اگر ایسے جرم کے ارتکاب کی کوشش کی گئی تھی اور اگر بعض پیشینگوئیوں کو خارج کرنے میں کامیابی ہوئی تو کتب مقدسہ میں قرآن[1] کے بیان کے مطابق اورپیشینگوئیاں کیونکر باقی رہ گئیں؟ اگر یہ عبارات فی الحقیقت حضرت محمد کے حق میں مندرج ہیں تو صاف ظاہر ہے کہ اس طور اوراس کے غرض سے بائبل محرف نہیں ہوئی جو اہلِ اسلام بیان کرتے ہیں۔ مثلاً قرآن کہتا[2] کہ سیدنا مسیح نے حضرت محمد کا ذکر کیا ہے ۔مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مسیح کا وہ وعدہ مراد ہے جو اس نے پراقلیط[3] کی آمد کے بارے میں کیا جو انجیل یوحنا کے ۱۶ ویں باب کی ۷ویں آیت میں مندرج ہے۔ مسیحی لوگوں کے نزدیک اس وعدہ کے موعود حضرت محمد نہیں ہیں لیکن یہ واحد حقیقت کہ یہ آیت اب تک عہدِ جدید میں موجود ہے اس امر پر صاف دلالت کرتی ہے کہ کسی نے اس کو خارج نہیں کیا۔ اگر مسیحیوں کو حضرت محمد کے حق میں مندرجہ عبارات کو خارج کرنا منظور ہوتا تو وہ ہر گز ہر گز اس آیت کو بائبل میں نہ رہنے دیتے کیونکہ یہی ایک آیت ہے جس کو قرآن حضرت محمد کے دعوے کی تائید میں صفائی سے پیش کرتا ہے۔ علاوہ بریں ان کے سب علماء جانتے تھے کہ مانی نے پراقلیط ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور اپنے دعویٰ کی تائید میں یہی آیت پیش کی تھی۔ توبھی جب وہ مفتری ثابت ہوا اوراس کا مذہب رویِ زمین سے نیست ہوگیا تو مسیحیوں نے اس آیت کو انجیل میں بدستور سابق قائم رکھا۔

یہودیوں کے پاس عہدِ عتیق میں بہت سی پیشینگوئیاں مسیح کے حق میں موجود تھیں۔ مسیحیوں نے کہا کہ پیشینگوئیاں بہت کچھ سیدنا مسیح میں پوری ہوچکی ہیں اوراس امر کو اس کے مسیح موعود ہونے کے ثبوت میں پیش کیا۔ ان پیشینگوئیوں میں یہودیوں کے لئے نہایت سخت فتوے مندرج تھے اور ہیں توبھی یہودیوں نے ان کو عہدِ عتیق سے خارج کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اگر وہ مسیح سے متعلقہ پیشینگوئیاں کو نیست کرنا چاہتے تو اپنی کتبِ مقدسہ سے عبارات ذیل کو بہت سی اور عبارات کے ساتھ محو کرنے کی کوشش کرتے۔ پیدائش ۴۹: ۱۰۔ استثنا ۱۸: ۱۵تا ۱۸۔ زبور ۲۲: ۱۴تا ۱۸۔

[1] سورۃ الاعراف آیت ۱۵۸ ۔ اس کتاب کے تیسرے حصہ کا دوسرا باب بھی ملاحظہ کیجئے۔

[2] سورۃ الصف آیت ٦

[3] یہ لفظ یونانی الاصل بمعنی شفیع وتسلی دینے والا ہے۔

یسعیاہ ۷: ۱۴ اور ۹: ۷ اور ۱۱: ۱ تا ۱۰- اور ۵۲: ۱۳ سے آخر تک اور ۵۳ - دانی ایل ۷: ۱۳، ۱۴ اور ۹: ۲۴ تا ۲۷ -میکاہ ۵: ۲: ذکریا ۱۲: ۱۰- کیونکہ ان تمام عبارات میں اس کا ذکر نہایت صفائی سے پایا جاتا ہے (لوقا ۲۴: ۲۷ بھی ملاحظہ کیجئے) پھر اور عبارات جو یہودی اگران میں جرات ہوتی تو عہدِ عتیق سے خارج کرنے کی کوشش کرتے وہ ہیں جو ان کے گذشتہ گناہوں کا بیان کرتی ہیں۔ لیکن یہ بھی تاحال عہدِ عتیق کے عبرانی اصل اور ترجموں میں موجود ہیں۔ خدا نے ان کو توریت کی شریعت کی محافظت کا حکم دیا تھا (یشوع ۱: ۷) اوراس میں ہر طرح کی کمی وبیشی سے منع فرمایا تھا (استثنا ۴: ۲ اور ۱۲: ۳۲) اسی واسطے انہوں نے اب تک تمام عہدِ عتیق کی نہایت ہوشیاری سے محافظت کی ہے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی لفظ یا حرف ضائع ہوجائے۔ انہوں نے ہر ایک کتاب کے الفاظ اور حروف گن کر ان کا شمار لکھ رکھا ہے۔ عہدِ عتیق کی عبرانی اصل کے نسخے جو مسیحیوں کے استعمال میں ہیں بالکل وہی ہیں جن کو یہودی استعمال کرتے ہیں۔ فی الحقیقت وہ ایک ہی مطبع کے مطبوعہ ہیں۔

تاکہ ایسا نہ ہو کہ کسی کے دل میں یہ شک باقی رہے کہ شاید یہودیوں نے مسیح سے پیشتر عہدِ عتیق کو محرف بنایا ہوا گرچہ بعد میں انہوں نے بالکل ایسا نہ کیا ہو۔ہم یہ کہنا مناسب سمجھتے ہیں کہ قرآن بالکل سچ کہتا ہے کہ مسیح نے ان کُتب مقدسہ کی تصدیق[1] کی جو ان کے پاس اس وقت تھیں اور وہ وہی ہیں جو اس وقت ان کے پاس ہیں۔ عہدِ جدید کہیں بھی مسیح یا اس کے رسولوں نے یہودیوں پر اپنی کتب مقدسہ کو محرف بنانے کا الزام نہیں لگایا اگرچہ ان کے واقعی گناہوں کا اظہار کیا گیا ہے۔ بخلاف اس کے عہدِ جدید ہر جگہ عہدِ عتیق کی صحت کا اظہار کرتا ہے اوراس کی تلاوت کی ترغیب دیتا ہے۔ چنانچہ یہ بات عبارات ذیل سے صاف ظاہر ہے: متی ۵: ۱۷ تا ۱۸- متی ۲۲: ۳۱ تا ۳۲- مرقس ۷: ۶ تا ۱۰- لوقا ۱۱: ۲۹ تا ۳۲- لوقا ۲۴: ۲۵ تا ۲۷- یوحنا ۵: ۳۹، ۴۵، ۴۷- ۲ تمیتھیس ۳: ۱۶- پس اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسیح اوراس کے رسولوں کے زمانہ میں عہدِ عتیق الہامی اور غیر محرف کتب کا مجموعہ تسلیم کیا گیا تھا۔ اگر یہودی اس کی تحریف کرتے تو مسیح یقیناً ان کو ایسی برائی کے سرزنش کرتے اور محرف عبارات کو ظاہر کرکے اپنے حواریوں کی تعلیم کے لئے ان کی تصحیح بھی کرتے۔

اس دلیل سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یروشلیم کی بربادی کے ایام میں جو نبوکد نصر بادشاہ کے زمانہ میں ہوئی یا بابل کی اسیری کے دنوں میں بھی کتب مقدسہ میں تحریف نہیں ہوئی ورنہ مسیح ضرور اس کا ذکر کرتے۔

بعض مسلمان مصنفین یہ کہنے کی جرات کرتے ہیں کہ تورات کے بعض مقامات میں قصداً تحریف کی گئی ہے۔ ان مقامات میں سے ایک استثنا

---

[1] سورہ آل عمران پانچواں رکوع اور سورہ مائدہ ساتواں رکوع تیسری آیت

۲۷: ۴ بیان کیا جاتا ہے۔ اس آیت میں سامری توریت میں کوہ گریزیم اور عبرانی میں کوہ عیبال مرقوم ہے۔ لیکن چونکہ نہ فقط عبرانی میں بلکہ تمام قدیم ترجموں (لاطینی ترجمہ عام سریانی پشطا، ارمنی اور ایتھیوپک) میں عیبال لکھا ہے لہذا عیبال ہی درست ہے۔یہودیوں نے نہیں بلکہ سامریوں نے اصل عبارت کو بدلنا چاہا تھا لیکن وہ بھی کامیاب نہ ہوئے یا ممکن ہے کہ کسی کاتب نے پہلے کاتب کی تحریر کو غلط خیال کرکے تصحیح کی کوشش کی ہو اور یوں اختلاف قرات پیدا ہوگیا کیونکہ بارھویں آیت میں مرقوم ہے کہ قو کو کوہ گریزیم پر کھڑا کرکے برکت کے کلمات کہے جائیں اگر یہودیوں کو کچھ بدلنا منظور ہوتا تو وہ ضرور چوتھی کی جگہ بارھویں آیت کو بدلتے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہودیوں نے اس عبارت کو نہیں بدلا۔ شاید سامریوں نے بدلنے کی کوشش کی لیکن وہ بھی اس میں کامیاب نہ ہوئے۔

پھر جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے وہ اعداد جن میں بزرگانِ دین کی عمریں پیدائش کے پانچویں اور گیارھویں باب میں مندرج ہیں توریت کے عبرانی نسخہ میں سامری سیپٹواجنٹ کے ترجمہ سے مختلف ہیں۔لیکن یہ قریباً بالکل اتفاقی امر ہے کیونکہ تمام کتابوں کے ہندسوں میں تخلیط واشتباہ کا بہت امکان ہے اوراس قسم کے اختلافات سے اخلاق و تعلیمات میں کچھ فرق نہیں آسکتا۔

بعض مصنفین اسلام نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بائبل میں بہت سے متناقض بیانات مندرج ہیں اوراس کو تحریف کی دلیل گرادنا ہے لیکن تمام اصحابِ عقل کے نزدیک یہ امر مسلمہ ہے کہ اگروہ مصنف جدا جدا کسی ایک ہی واقعہ کا بیان لکھیں توضرور ان کے بیانات میں کچھ فرق پایا جائیگا ورنہ ان کی باہمی سازش ثابت ہوگی۔ جو کوئی تمام متعلقہ امور سے واقف نہ ہو اس کی نظر میں ایسے اختلافات تناقض پر دلالت کرینگے لیکن جو اصحاب علم کافی تحقیق وتدقیق سے کام لینگے ان کو کوئی صوری یا معنوی تناقض نظر نہیں آئیگا۔ ایسے اختلافات کا وجود ہی جیسا کہ سیدنا مسیح کے دو نسب ناموں میں (متی ۱ ولوقا ۳) اور یہوداہ کی موت کے دو بیانوں میں (متی ۲۷: ۵۔ اور اعمال الرسل ۱: ۱۸، ۱۹) پایا جاتاہے اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ کسی نے کتبِ مقدسہ کو محرف نہیں بنایا ورنہ یہ اختلافات موجود نہ ہوتے۔

پھر بعض کہتے ہیں کہ مرقس ۱۶: ۹، ۲۰۔ یوحنا ۵: ۳، ۴ اور ۷: ۵۳ سے آخر تک اور ۸: ۱۱ اور ۱ یوحنا ۵: ۷ کی عبارات کو داخل کرنے سے عہدِ جدید کی تحریف کی گئی ہے۔ یہ کہنا بالکل درست نہیں ہے۔ ہم مسیحی لوگ یہ دریافت کرچکے ہیں کہ یہ آیات قدیم ترین مسودوں میں موجود نہیں ہیں اور ہم ان کو حواشی کے طور پر سمجھتے ہیں جن کو کسی کاتب نے اصل عبارت کا جزو خیال کرکے متن میں درج کردیا۔ لیکن ان آیات سے کسی تعلیم میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں پیدا ہوتی ۔ جن واقعات کا ذکر مرقس ۱۶: ۹ - ۲۰ میں پایا جاتا ہے وہ اناجیل کے دیگر مقامات میں بالتفصیل والتشریح مندرج ہیں۔ زانیہ کا قصہ پیپیس مورخ نے لکھا ہے ۔ تثلیث مقدس کی تعلیم متی ۲۸: ۱۹ اور

بہت سے اور مقامات میں نہایت صفائی اور صراحت کے ساتھ دی گئی ہے۔ لہذا اگر یہ مذکورہ بالاآیات عہدِ جدید کے متن سے خارج بھی ہوجائیں تو مسیحی دین کی کسی تعلیم کو کچھ نقصان نہیں پہنچتا۔

اس لحاظ سے بائبل اور قرآن میں بڑا فرق ہے۔ اصحابِ علم خوب جانتے ہیں کہ شیعہ لوگوں میں سے بعض یہ کہتے ہیں کہ خلیفہ عمر اور عثمان نے قرآن کی بعض آیات کو بدل ڈالاہے تاکہ حضرت علی کے خلیفہ اول ہونے کے وجود اوراس کے خاندان کی امامت کو دوام کو پوشیدہ رکھیں۔ بعض کے نزدیک اسی مذکورہ بالا غرض سے ایک پوری سورۃ یعنی سورۃ النورین متن قرآن سے بالکل خارج کردی گئی ہے۔ ہم کو اس امر کے صدق وکذب سے کچھ بحث نہیں ہے اگرچہ یہ معاملہ اہلِ اسلام کے لئے نہایت ہی توجہ اور غور وفکر کے لائق ہے اس لئے کہ اگر سورۃ النورین بھی فی الحقیقت جزو قرآن ہے تو اہل تسنن کا انجام ناگفتہ بہ ہے کیونکہ سورۃ النورین میں مرقوم ہے ان لھمہ فی جھنم مقاما عنہ لایعدن لون یعنی تحقیق جہنم میں ان کے لئے مقام ہے جس سے وہ نہیں نکلینگے۔ میرزا محسن فانی متوطن کشمیر نے اپنی کتاب وبستان مذاہب مطبوعہ بمبئی ۱۲۹۲ء کے صفحہ: ۲۲۰و ۲۲۱ پر تمام سورۃ النورین درج کی ہے اور لکھا ہے " وہ بعضے ازایشاں گویند کہ عثمان مصاحف راسوختہ بعضے ازسورہ کہ درشانِ علی وفضلِ آلش بود براند اخت دیکے ازان سورہا این است " (دبستان مذاہب صفحہ ۲۲۰)۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ بعض علی الھی کہتے ہیں کہ یہ موجودہ قرآن وہی نہیں جو حضرت محمد پر نازل ہوا تھا جیسا کہ عام مسلمان مانتے ہیں بلکہ ان رافضیوں کی رائِ میں حال کا موجودہ قرآن حضرت ابوبکر وعمر عثمان کی تالیف ہے۔ بیشک تمام علماء ان بیانات کو غلط جانتے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ یہ بعض مسلمانوں کے کسی حد تک مدلل بیانات ہیں۔ اس مقام پر فقط یہ کہنا کافی ہے کہ اگر اسلام اللہ جل شانہ کی طرف سے راہِ نجات ہے تو متنِ قرآن میں مذکورہ بالاافراط وتفریط ہر ایک مسلمان کی نجات کو نقصان پہنچاتی ہے اور بخلاف اس کے بائبل کے متن کے متعلق جو بحث پیش کی گئی ہے اس سے نہ کسی مسیحی کی نجات میں کوئی دقت پیش آتی ہے اور نہ مسیحی دین کی کوئی تعلیم ہی مشکوک ٹھہرتی ہے۔

بعض مسلمان بائبل کا ایک اور نقص یہ بیان کرتے ہیں کہ بعض کتب جو کسی زمانہ میں بائبل میں شامل تھیں اب مفقود ہیں مثلاً کتاب الیاشر (یشوع ۱۰: ۱۳) اور خداوند کا جنگنامہ (گنتی ۲۱: ۱۴) لیکن یہ کتابیں کبھی بائبل کا جزو نہ تھیں جیسا کہ جن کتابوں کا ذکر قرآن میں ہے مثلاً صحفِ ابراہیم وغیرہ قرآن[1] کا جزو نہ تھیں۔

---

[1] سورہ بقرہ آیت ۱۳۰ وبیضاوی لکھتاہے جو کچھ ابراہیم پر نازل ہواوغیرہ سے الصحف مراد ہے) سورہ آل عمران آیت ۷۸۔ سورہ نسا آیت ۱۶۱ ۔ سورہ بقرہ آیت ۲۸۵ میں وکتبہ اور سورہ اعلیٰ آیت ۱۹ میں صحفِ ابراہیم ملاحظہ کیجئے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رومن کیتھولک کلیسیا کی بائبل میں چند ایسی کتابیں موجود ہیں جو پروٹسٹینٹ کلیسیا کی بائبل سے مفقود ہیں۔ اس کے جواب میں یہ جاننا چاہیے کہ عہدِجدید تو تمام مسیحیوں کے پاس بالکل یکساں ہے صرف عہدِ عتیق میں رومن کیتھولکوں نے بعض ایسی کتابیں شامل کرلی ہیں جن کو قدیم مسیحیوں نے قبول نہیں کیا اور جو یہودیوں کی کتبِ دین میں شامل نہ تھیں اور عبرانی زبان میں ان کا وجود نہیں ہے۔ ہم پروٹسٹینٹ مسیحی عہدِ عتیق کی عبرانی کتب دین کو مانتے ہیں جو سیدنا مسیح اوراس کے رسولوں کی مقبول ومصدقہ ہیں اورانہیں کے وسیلہ سے ہم تک پہنچی ہیں۔ لیکن اگر رومن کیتھولک کلیسیا کی زائد کردہ کتابیں بائبل میں شامل کر بھی لی جائیں تو مسیحی دین کی کسی تعلیم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ رومی ویونانی اور پروٹسٹنٹ کلیساؤں کی تعلیمات میں اختلافات بیشک موجود ہیں لیکن ان اختلافات کی بنیاد مختلف کتبِ دین پر نہیں ہے۔ جیسا کہ اہلِ اسلام میں بہت سے فرقے موجود ہیں اوران کے باہمی اختلاف کی بنیاد قرآنی اختلافات پر نہیں کیونکہ قرآن توان سب کے پاس ایک ہی ہے۔

ہم عہد عتیق وجدید کے ان قدیم مسودوں کا ذکر کرچکے ہیں جو اصل زبانوں میں مرقوم ہیں اور مختلف زبانوں میں جو آج کل کہیں بھی بولی نہیں جاتیں ان کے ترجموں کا بھی ذکر کرآئے ہیں۔ لیکن علاوہ برین ہم کو قدیم مسیحی مصنفین کی شہادت کا بھی ذکر کرنا ہے جواس باب کے مضمونِ زیر بحث پر ملتی ہے۔ایسے سینکڑوں مصنفین کی تصانیف موجود ہیں جو یونانی، لاطینی، سریانی، قدیم مصری اور ارمنی زبان میں پہلی صدی مسیحی سے لے کر حضرت محمد کے ایام اوران کے بعد تک لکھی گئیں۔ سب سے پہلی غیر دینی مسیحی تحریر اب تک موجود ہے کرنتھیوں کے نام کلیمنٹ رومی کا خط ہے (۹۳ سے ۹۵)۔ پھر اس کے بعد اگنیشیس کے ساتھ خطوط ہیں (۱۰۹ سے ۱۱۶ء تک) اورایک پولی کارپ کا خط (قریباً ۱۱۰ء) پھر وہ خط جو غلطی سے برنباس سے منسوب کیا گیا ہے (۱۰۰ سے ۱۳۰ء تک)۔ ان سبھوں نے یونانی زبان میں لکھا اور یہ خطوط اب تک ہمارے پاس موجود ہیں۔ ان کے بعد اور بہت سے مصنفین نے جن کا ہم ذکر کرچکے ہیں دیگر زبانوں میں لکھا۔ جن کی تصانیف کلی یا جزوی صورت میں موجود ہیں وہ سب اس حقیقت پر شہادت دیتے ہیں کہ ان کے زمانہ میں مسیحیوں کا دین وہی تھا جو اب ہمارے پاس بائبل میں موجود ہے۔ علاوہ برین ان مصنفین کی تصانیف میں کتب مقدسہ سے اقتباسات پائے جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ فقط مطلب ہی بیان کردیتے ہیں لیکن بعض اوقات عہدِجدید کی آیات کو اصل عبارت میں لفظ بلفظ نقل کرتے ہیں۔ یہ بھی اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ سنہ ہجری سے پیشتر یا بعد ازاں بائبل میں کبھی تحریف نہیں ہوئی اور عہد عتیق وجدید کی کتابوں کے عوض میں کبھی کوئی دوسری کتاب قبول نہیں کی گئی۔

اگر بے دین وبدکار لوگوں کی کوئی جماعت حضرت محمد کے ایام میں یا ان کے بعد کتبِ مقدسہ کی تحریف وتخریب کا ارادہ کرتی تو اسے ایسا کرنا بالکل امر محال معلوم ہوتا۔ ان کو عبرانی ویونانی زبان میں بائبل کے تمام قدیم مسودے جہاں کہیں ہوتے حاصل کرکے محرف بنانے پڑتے اوراس لئے ان کو یورپ کے بہت سے حصے اور ایشیا وافریقہ میں سفر کرنا پڑتا اور ہر ایک عبادت خانہ وکتب خانہ اور تمام معزز یہودونصاریٰ کے گھروں میں جانا ہوتا اوراس کے ساتھ ہی بائبل کے تمام ترجمے جو لاطینی ، یونانی اور قدیمہ مصری ، گاتھک ، سریانی، ایتھیوپک، ارمنی اورجارجین وغیرہ زبانوں میں تھے حاصل کرکے ان کو بھی بدلنا ہوتا۔ پھر سامریوں کے پاس جاکر ان کے قدیم ومحفوظ مسودہ ہای توریت اوراس کے سامری ترجموں میں ردوبدل کی اجازت لینے کی ضرورت ہوتی۔ یہودیوں کو اپنا ارمنی ترجمہ خراب کرنا پڑتا۔ پھر اس جعلساز جماعت کے لئے یہ بھی ضروری ہوتا کہ مذکورہ بالازبانوں میں جو مسیحی تصانیف موجود تھیں ان کو حاصل کرتے اوران میں جس قدر بائبل کے اقتباسات مندرج تھے ان سب کو بھی بدلتے۔ اگر ان کی تحریف وتخریب سے کسی زبان میں ایک کتاب بھی بچ جاتی توان کی تمام محنت وکوشش رائیگاں جاتی۔ علاوہ برین یہ بھی ضروری ٹھہرتا کہ وہ تمام یہود ونصاریٰ کو نسیان کے مرض میں مبتلا کرتے اور ان کے دل ودماغ سے بائبل کا تمام علم خارج کرتے اور ان کے حافظ کی تختیوں کو بالکل دھوڈالتے۔ کوئی ذی ہوش کبھی ان سب باتوں کو ممکن تصور نہیں کرسکتا اور کسی طرح سے اس امر کو ممکنات میں سے خیال نہیں کرسکتا کہ تمام یہود ونصاریٰ تحریف وتخریب بائبل کے جرم[1] کے ارتکاب کی غرض سے متفق کئے جائیں اوراس جرُم کے مرتکب وہ اس لئے ہوں کہ اس جہان میں اہلِ اسلام کے ظلم وتشدد کی برداشت کریں اور عالمِ آخرت میں غضب الہیٰ کے مستوجب ٹھہریں۔

اگر ممکن ہو تو ہم ایک ایسی اسلامی جماعت کا خیال تصور کریں جس نے اب یا چھاپہ خانہ کی ایجاد سے پیشتر یہ مصمم ارادہ کیا ہو کہ قرآن کے تمام موجودہ نسخوں اور تمام اسلامی ممالک کی تمام دینی کتابوں کو محرف بنائے۔ ایسا خیال کس قدر بے ہودہ معلوم ہوتا ہے ! حالانکہ قرآن کا اتنی متعدد زبانوں میں ترجمہ نہیں کیا گیا ہے جتنی زبانوں میں حضرت محمد کے ایام میں بائبل کا ترجمہ موجود تھا۔ اگر قرآن کے تمام نسخے مفقود یا محرف بھی ہوجاتے تو اس کے متن کی تمام عبارت مفسرین کی تفاسیر کے مندرجہ اقتباسات کو جمع کرنے سے بآسانی دوبارہ فراہم ہوسکتی تھی بلکہ ایسی کتابوں سے بھی جیسی کہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں: سیرۃ الرسول، کتاب المغازی، فتوح الشام، فتوح المصر، اور فتوح العجمہ۔ نیز الطبری وابن اثیر کی کتب تواریخ سے اور دیگر کتب قدیم سے۔ اگر یہ سب

---

[1] قرآن (سورہ آل عمران آیت ۱۰۹ ، ۱۱۰) میں مندرج ہے کہ حضرت محمد کے ایام میں اھل الکتاب میں ایسے لوگ تھے جوراہِ راست پر تھے اوررات کے وقت کتاب پڑھتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے (۱) یہ نیک لوگ تحریف کی اجازت نہ دیتے (۲) کتاب موجود تھی (۳) مشہور اور پڑھی جاتی تھی

کتابیں ایک ہی زبان میں ہوتیں تو بھی ان سب کو محرف بنانا یا بدلنا کسی کے نزدیک بھی ممکن متصور نہیں ہوسکتا لیکن بائبل کے اقتباسات مختلف زبانوں میں تصانیف میں موجود تھے لہذا ان سب کو بدلنا اور محرف بنانا تو اور بھی ناممکن تھا۔

لیکن اگر یہ غیر ممکن الوقوع تحریف وتخریب وقوع میں آبھی جاتی تو گذشتہ چند سال کی دریافتوں کے ذریعہ سے جو قدیم ترین مسیحیوں کی گم گشتہ تصانیف کے مسودے برآمد ہوئے ہیں ان کے وسیلہ سے محرفین کی جعلسازی فاش ہوجاتی ۔ یونانی وقدیم مصری اور ارمنی وسریانی زبان کی بہت سی قدیم کتابیں جو تمام علما کے نزدیک صدہا سال سے گم گشتہ تھیں اور جن کے نام ہی نام ہم کو معلوم تھے پرانے کتب خانوں اور خانقاہوں وغیرہ سے برآمد ہوئی ہیں۔ ان میں سے تین خاص طور سے مشہور ہیں (۱) بارہ رسولوں کی تعلیم (۱۳۱ء سے ۱۶۰ءتک) (۲) ارسٹڈیز کی معذرت (۱۳۸ء سے ۱۴۷ءتک) اور(۳)ڈایٹیسرن ان ٹیٹن (۱۶۰ءسے ۱۷۰ءتک)۔ چونکہ یہ کتابیں حضرت محمد کی ولادت سے بہت عرصہ پیشتر گم ہوچکی تھیں اس لئے ان کے بارے میں یہ کہنا بالکل ناممکن ہے کہ آنحضرت کے ظہور کے بعد ان میں تحریف وتخریب کی گئی ۔ان کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قدیم زمانہ میں بھی مسیحی دین کی تعلیمات وہی تھیں جوزمانہ حال میں تمام جہان کے مروجہ عہد عتیق وجدید میں پائی جاتی ہیں لہذا جس مسیحی دین کی تعلیم بائبل میں دی جاتی ہے اس میں رسولوں کے زمانہ سے لے کرآج تک کسی طرح کی کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی۔

علاوہ برین ایک حقیقت اور ہے جس سے تحریف کے متعلق عوام کے اعتقاد کی تردید ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب حضرت عمر کی افواج نے سیریا وعراق اور مصر کو فتح کیا تو قیصریہ واسکندریہ اور بہت سے دیگر مقامات پر ان کو بہت سے بڑے بڑے کتب خانے ملے جو کتابوں سے پُرتھے اور ان میں کتب مقدسہ کی بہت سی جلدیں اور مسیحی معلموں کی تصانیف تھیں۔ اہلِ اسلام یہ کرسکتے تھے کہ ان کتابوں کو بحفاظت رکھ چھوڑتے اور پھر ان کی مدد سے یہ دریافت کرتے کہ آیا زمانہ مابعد میں مسیحیوں نے کتب مقدسہ کی تحریف وتخریب کی ہے یا نہیں۔ لیکن ابوالفرح بتاتا ہے کہ جب حضرت عمر سے پوچھا گیا کہ اسکندریہ کے کُتب خانہ سے کیا کیاجائے تو اس نے اسے نیست ونابود کرنے کا حکم دیا اوراس حکم کی تعمیل کی گئی۔ اس طرح سے کشف الظنون کا مصنف لکھتاہے کہ جب سعد ابن ابی وقاص نے فارس کو مفتوح کیا تو حضرت عمر نے فارسی کتب خانوں کو بھی نیست ونابود کرنے کا حکم دیدیا۔ اس وقت بائبل کے جونسخے مسلمانوں کے ہاتھ آئے تھے اگر وہ ان کو برباد نہ کرتے بلکہ بحفاظت رکھ چھوڑتے توزمانہ مابعد میں ان کی تحریف وتخریب کوروک سکتے تھے کیونکہ اگر کوئی کتبِ مقدسہ کی تحریف کا قصد بھی کرتا تو ان قدیم نسخوں کی موجودگی کے سبب سے تحریف کا کام ناممکن ٹھہرتا ۔ مسلمان قرآن کو کتاب

الله کا مھیمن [1] یعنی محافظ مانتے ہیں۔ اگر وہ محافظت کرتے تو نہایت مناسب ہوتا لیکن جو کچھ مسلمانوں سے نہ ہوسکا وہ مسیحیوں نے کیا کیونکہ جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں ہمارے پاس بائبل کے بہت سے ایسے مسودے موجود ہیں جو سنہ ہجری سے کئی سو سال پیشتر لکھے گئے اور جو اس بربادی سے بچ گئے جو اسکندر یہ اور دیگر مقامات کے کتب خانوں میں واقع ہوئی۔ تعلیم یافتہ مسلمان جو روم اور سینٹ پیٹرز برگ یا پیرس اور لنڈن کی سیر کرتے ہیں وہ ان قدیم مسودوں میں سے بعض کو اپنی آنکھوں دیکھ سکتے ہیں۔ انہیں پرانے اور قدیم مسودوں کے باہمی مقابلہ کے بعد ہمارا موجودہ یونانی عہدِجدید اور عبرانی عہدِ عتیق چھاپے گئے ہیں اوراب آٹھ سو سے زیادہ زبانوں میں ان کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

جو شہادت ہم نے اس باب میں مختصراً مندرج کی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ زمانہ ماضی کے بڑے بڑے عالم مسلمان مفسرین اور زمانہ حال کے بڑے بڑے علمایِ اسلام بجا فرماتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ کی کتب مقدسہ میں حضرت محمد کے ایام سے پیشتر یا بعد ازاں تحریف وتخریب نہیں ہوئی۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ عہدِ عتیق وجدید کبھی منسوخ نہیں ہوئے اور جن واقعات کے بیانات ان میں مندرج ہیں اوران اصول اخلاق اور تعلیمات پر وہ شامل ہیں ان کی تنسیخ کبھی ہو بھی نہیں سکتی۔ یہ بات ہم ثابت کرچکے ہیں کہ عہدِ عتیق وجدید جو زمانہ حال میں یہود و نصاریٰ میں رائج ہیں وہی ہیں جو حضرت محمد کے

[1] سورہ مائدہ آیت ۵۲

ایام میں ان کے پاس تھے اور جن پر قرآن شہادت دیتا ہے اوران کو بڑے بڑے عالیشان القاب سے ملقت کرکے مسلمانوں کو ان پر ایمان [2] لانے کا حکم دیتا ہے اوراپنے نزول کا اصل مقصد ان کی تصدیق وحفاظت [3] بیان کرتا ہے۔

لہذا ہم صاف اس صحیح نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جو مسلمان صدقِ دل سے قرآن پر ایمان لاتے ہیں ان کو ضرور ہوشیار رہنا چاہیے تاکہ جہلاکے تعصب کے سبب سے گمراہ نہ ہوں بلکہ بائبل کو اپنے لئے نور وہدایت [4] تسلیم کرنے قرآن کی فرمانبرداری کریں۔ اس لئے خدای رحم ورحمان سے دعا کرتے ہوئے بائبل کو بغور مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ وہ اس کی تعلیمات کو سمجھنے کے لئے انشراح صدر کی بخشش عنایت کرے اور صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق بخشے اور مغضوبِ الہیٰ گمراہوں کی راہ سے بچائے۔

[2] سورہ بقرہ آیت ۱۳۰ اور سورہ آل عمران آیت ۷۸۔

[3] سورہ مائدہ آیت ۵۲

[4] سورہ مومن آیت ۵۶